قادیانیت

مطالعہ ——— و ——— جائزہ

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ
و
رکن عربی اکادمی، دمشق

ناشر
سید احمد شہید اکیڈمی
لاہور ○ پاکستان

قادیانیت

مُطالعہ ـــــ و ـــــ جائزہ

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

و

رکنِ عربی اکادمی، دمشق

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

لاہور ○ پاکستان

جدید ایڈیشن

طبع اول : ۱۹۵۹ء

طبع دوم : ۱۳۸۶ھ ، ۱۹۶۶ء

طبع سوم : ۱۴۲۴ھ ، ۲۰۰۳ء

طبع چہارم : ۱۴۲۷ھ ، ۲۰۰۶ء

مصنف : مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

کتابت : سید انور حسین نفیس رقم

مطبع : اولمپیا آرٹ پریس لاہور

تعاون : ملک محمد اشعر

قیمت :

سید احمد شہید اکیڈمی

لاہور ○ پاکستان

مُصنّف کی دُوسری تصنیفات :

① سیرتِ محمّدی کا پیغام، بیسویں صدی کی دُنیا کے نام
② سیرتِ محمّدی —— دُعاؤں کے آئینہ میں
③ تاریخِ دعوت و عزیمت —— حصّۂ اوّل، دوم، سوم
④ سیرت سید احمد شہیدؒ —— حصّۂ اوّل، دوم
⑤ تذکرۂ حضرت مولانا فضلِ رحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ
⑥ مولانا محمّد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت
⑦ سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری رحمۃ اللہ علیہ
⑧ اِنسانی دُنیا پر مُسلمانوں کے عُروج و زوال کا اثر
⑨ اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش
⑩ مذہب و تمدُّن
⑪ مقامِ انسانیت
⑫ پیامِ انسانیت
⑬ شرقِ اوسط میں کیا دیکھا ؟
⑭ دو ہفتے ترکی میں
⑮ ہندوستانی مُسلمان

فہرست

باب چہارم

تحریکِ قادیانیت کا تنقیدی جائزہ

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قادیانیت اسلام سے خارج اور اسلام کے خلاف خطرناک برطانوی سازش سے پیدا ہونے والا ایک عالمی فتنہ اور غیر مسلم فتنہ ہے، جس نے اسلام کا چولا پہن کر اسلام کے قلعہ میں نقب لگانے کی زبردست کوشش کی، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو آج واقف حال، اور پڑھا لکھا ہی نہیں عامی مسلمان بھی جانتا ہے۔

لیکن ۵۷-۱۹۵۸ء میں جب لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے بین الاقوامی سطح پر مجلس مذاکرات اسلامی کا انعقاد ہوا تھا، جس میں عالم اسلام اور مغربی ممالک سے ممتاز اور سر آوردہ علماء و مفکرین کی شرکت بڑے پیمانہ پر ہوئی تھی، اُس وقت مصر، شام و عراق کے علماء قادیانیت کے بارے متجسس تھے، اُن کے سامنے کوئی کتابچہ نہیں تھا جس سے انہیں اِس نامراد و شقی فرقہ سے واقفیت حاصل ہو سکتی۔

حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا برصغیر اور پھر عالمِ عربی پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اپنے خلیفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو بتاکید مامور فرمایا کہ وہ اس موضوع پر عربی میں کتاب تحریر فرمائیں، حضرت اقدس کی ایماء اور اہتمام کا نتیجہ تھا کہ عربی میں " القادیانی و القادیانیہ " کے نام سے حضرت مولانا ندوی نے کتاب تیار فرمائی، پھر حضرت ہی کے حکم پر اسے اردو میں منتقل فرمایا، اور مزید اتنے اضافے فرمائے کہ وہ ایک مستقل کتاب بن گئی، جس کی کتابت کا فریضہ حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ نے انجام دیا اس کتاب کی طباعت اور نشرواشاعت " مکتبہ دینیات " ۱۳۴۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں ہوئی تھی۔

عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت قابلِ مبارک و لائق شکریہ وسپاس ہے کہ اس نے انکارِ ختمِ نبوت کے اس فتنہ کو دفن کرنے، اس کی قلعی کھولنے، اور اس کی حقیقت سے آگاہ کرنے کا وہ کارنامہ انجام دیا، جو اصلاحِ معاشرہ اور تجدیدِ دین کی کوششوں میں سب سے زیادہ بنیادی کوشش ہے۔

اس عظیم تحریک کے بانیان و علمبرداران آپ ... فرض کفایہ انجام دے رہے ہیں اور اُمت کو اپنے نبیؐ کی نبوت و رسالت سے مربوط کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

حضرت شاہ نفیس الحسینی دامت برکاتہ دین کے مختلف شعبوں کی تجدید و سرپرستی فرمارہے ہیں، شیعیت اور ناصبیت کے درمیان نقطۂ حق واعتدال کو ابھارنے اور روشن فرمانے کے ... کا سہرا انہیں کے سر ہے، قادیانیت کی سرکوبی کے لیے "... " نامی اس کتاب کی جدید و معیاری اشاعت کا فیصلہ نہایت ہی مبارک ہے، خداتعالیٰ انکارِ ختم نبوت کے فتنہ کے استیصال ... اسے قبول فرمائے۔ آمین

نیچمداں: ... اسعدی

۴ ... ۱۴ ... ھ

حرفِ گفتنی

دسمبر ۱۹۵۷ء کے اواخر اور جنوری ۱۹۵۸ء کے اوائل میں پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام لاہور میں مجلسِ مذاکراتِ اسلامی (اسلامک کلوکیم) کا انعقاد ہوا جس میں عالمِ اسلام اور مغربی ممالک کے بہت سے ممتاز و نامور اہلِ علم اور اہلِ فکر نے شرکت کی۔ خاص طور پر شرقِ اوسط کے سربرآوردہ علمائے اپنے ملک کی نمائندگی کی۔ مجلسِ مذاکرات کے ناظم و داعی کی طرف سے دعوت وصول ہونے کے باوجود راقمِ سطور ان تاریخوں میں نہیں پہنچ سکا۔ مجلس کے اختتام کے بعد ہی جب لاہور پہنچا تو مجلسیں اس کے تذکرہ سے گرم تھیں۔ بخصوصیت کے ساتھ مصر و شام کے نمائندوں نے شریعتِ اسلامی کی جو پُر زور وکالت اور اپنی دینی حمیت کا جو شاندار مظاہرہ کیا تھا، اُس کا اعتراف اور تذکرہ عام تھا۔

اس مجلس میں شرکت کے لیے مصر و شام و عراق کے جو علماء و اساتذہ آئے تھے۔ اُنھوں نے ہندوستان و پاکستان کی مشہور مذہبی تحریک قادیانیت اور اس کے اساسی عقاید و خیالات کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اُن کی یہ جستجو اور تحقیق کا شوق بالکل حق بجانب اور قدرتی امر تھا۔ اسی سرزمین میں اس تحریک کا ظہور اور نشو و نما ہوا اور یہیں سے اُس کے متعلق مستند معلومات اور مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر ان کے پاکستانی و ہندوستانی دوستوں کو اس خلا کا شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اُن کو پیش کرنے کے لیے عربی میں جدید طرز کی

کوئی کتاب موجود نہیں۔ اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ میں جب لاہور پہنچا تو میرے شیخ و مربی حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری مدظلہٗ[1] نے اس موضوع پر عربی میں ایک مکمل کتاب کی تالیف کا حکم دیا۔

شرق اوسط کی سیاحت اور مصر و شام کے قیام کے دوران میں اگرچہ بارہا اس ضرورت کا خود احساس ہوا تھا لیکن اس کی طرف توجہ کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ موضوع اُفتادِ طبع اور اس وقت تک کی ذہنی تربیت کے خلاف تھا۔ مصنف کا ذوق اس وقت تک قادیانی لٹریچر اور خود مرزا صاحب کی تصنیفات کے مختصر سے مختصر حصہ کے مطالعہ کے لیے بھی کبھی آمادہ نہیں ہو سکا تھا اور وہ اس کوچہ سے یکسر نابلد تھا[2]۔ لیکن اس تحریک نے (جس کی تعمیل عین سعادت تھی) اس موضوع کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے کی تقریب پیدا کر دی۔ چند ہی دن میں قیامگاہ کا ایک کمرہ قادیانی لٹریچر کا کتاب خانہ اور دار التصنیف بن گیا اور پوری یکسوئی اور انہماک کے ساتھ یہ کام شروع ہوا۔ ایک مہینہ اس علمی و تصنیفی اعتکاف میں اس طرح گزرا کہ گویا دنیا کی خبر نہ تھی اور سوائے اس موضوع کے کوئی دوسرا موضوعِ فکر نہ تھا۔

---

[1] افسوس ہے کہ ۱۴ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ یوم پنجشنبہ مطابق ۱۶ اگست ۱۹۶۲ء کو لاہور میں آپ نے وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ و رفع درجاتہ۔

[2] اس سے پیشتر ۱۹۵۳ء میں مصنف کا ایک مختصر رسالہ (جو دراصل ایک خط تھا جو تحریک ختم نبوت کے دوران میں چند عرب دوستوں کے نام بھیجا گیا تھا) "القادیانیۃ ثورۃ علی النبوۃ المحمدیۃ والاسلام" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مکتوب یا رسالہ کی تحریر کے وقت راقم کے پیش نظر صرف اردو کے دو ایک رسائل تھے اور انھیں کی مدد سے یہ رسالہ لکھا گیا تھا۔ اس لیے مصنف کا یہ لکھنا صحیح ہے کہ اس کو اس کتاب "قادیانیت" کی تصنیف کے وقت تک اصل قادیانی لٹریچر کے مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور وہ اس کوچہ سے یکسر نابلد تھا۔

مصنف کا ذہن چونکہ فطرۃً تاریخی واقع ہوا ہے اور وہ اس شہر میں بالکل نو وارد تھا اس لیے اس نے اپنا سفر تحریک کے آغاز سے شروع کیا اور اس کے نشوونما اور ارتقا کی ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلہ کا جائزہ لیتا ہوا چلا۔ گویا اس کے مشاہدات اور معلومات تحریک کی طبعی نشوونما کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اس طرزِ مطالعہ نے تحریک کی فطرت و مزاج اور اس کے تدریجی ارتقا اور اس کے مضمرات کے سمجھنے میں بڑی مدد دی اور بعض ایسے حقائق کا انکشاف کیا جو اس تحریک کو ایک مکمل شکل میں دیکھنے سے ظاہر نہیں ہو سکتے۔ مصنف نے مرزا غلام احمد صاحب کی تصنیفات کا براہِ راست مطالعہ کیا اور انھیں کے ذریعہ ان کی دعوت و تحریک اور نظام کو سمجھنے اور ایک غیر جانبدار مورخ اور طالب حق کی طرح آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس مطالعہ و جستجو کا نتیجہ وہ عربی کتاب تھی جو "القادیانی و القادیانیۃ" (مرزا غلام احمد صاحب اور ان کی تحریک قادیانیت) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

اس کتاب کے تیار ہو جانے کے بعد حضرت مولانا عبد القادر صاحب مدظلہٗ کا حکم ہوا کہ اس کا اردو میں ترجمہ بھی کر دیا جائے چونکہ اس ترجمہ میں اصل عبارتوں کو نقل کرنا تھا، اس لیے دوبارہ اس پورے کتب خانہ کی ضرورت پیش آئی جو لاہور میں فراہم کیا گیا تھا۔ مناسب سمجھا گیا کہ اس کام کی تکمیل بھی لاہور میں ہو۔ چنانچہ دوبارہ لاہور کا سفر کیا گیا اور الحمد للہ کہ یہ عربی کتاب اردو میں منتقل ہو گئی۔ اس کتاب کو ترجمہ کہنے کے بجائے اس موضوع پر مستقل تصنیف کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ عبارتیں (جن کا کتاب میں حوالہ دیا گیا ہے) پوری احتیاط کے ساتھ اپنے

صحیح مآخذ سے نقل کی گئی ہیں۔ عربی کے مقابلہ میں کچھ قیمتی اضافے اور بعض مفید ترمیمیں بھی کی گئی ہیں۔

مناظرانہ و متکلمانہ مباحث کی ہندوستان کے دورِ آخر میں ایک خاص زبان اور خاص اسلوب تحریر بن گیا ہے جس کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے، مصنف نے اس کی پابندی ضروری نہیں سمجھی۔ اس کتاب میں مناظرانہ جوش کے بجائے مؤرخانہ متانت زیادہ ملے گی اور جو لوگ مناظرانہ و دفاعانہ کتابوں کے ایک خاص طرز اور لہجہ کے عادی ہیں، شاید اُن کو اس کتاب کو پڑھ کر مایوسی اور شکایت ہو لیکن مصنف اس کے لیے معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس نے یہ کتاب جس طبقہ اور جس مقصد کے لیے لکھی ہے اور جو معیار اس کے لیے مقرر کیا ہے، اس کے لیے یہی طرز مناسب تھا۔

میں اپنے ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا شکر گذار ہوں جنھوں نے میری علمی رہنمائی کی ضروری کتابیں فراہم کیں اور اس کام کی تکمیل کے لیے میرے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت اور راحت کا اہتمام کیا۔ اگر ناچیز مصنف نے اس کتاب کی تالیف سے دین کی کوئی خدمت انجام دی ہے تو یقیناً یہ سب اس اجر میں شریک ہیں۔

قارئین سے آخر میں یہ گذارش کرنی ہے کہ زندگی تو بڑی چیز ہے، انسان اپنا حقیر سے حقیر اندوختہ اور ملکیت بھی بے محل صرف کرنے سے احتیاط کرتا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے بھی امین و محافظ کی تلاش کرتا ہے۔ ایمان (جس پر نجات اور آخرت کی ابدی سعادت کا انحصار ہے) یقیناً اس سے زیادہ مستحق ہے کہ انسان اس کے بارے میں پوری احتیاط غور و فکر

سے کام لے اور جذبات و تعلقات اور دنیوی منافع سے بالکل صرفِ نظر کرلے۔ یہ کتاب اپنے مستند و مرتب معلومات، بانیٔ تحریک کے بیانات اور تحریروں اور تاریخی وثائق کے ذریعہ [illegible] روشنی اور [illegible] انداز میں ڈالتی ہے جو ایک سلیم الطبع اور انصاف پسند انسان کو صحیح اور بے تکلف رائے تک [illegible] پہنچنے میں مدد دیتے ہیں۔ وعلی اللہ قصد السبیل۔

پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم کی کتاب "قادیانی مذہب" نے مصنف کی ابتدائی رہنمائی کی اور اس سے کتاب کی ترتیب اور خاکہ بنانے میں بڑی مدد ملی۔ اگرچہ مصنف نے منقولات و اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا اور مرزا صاحب اور قادیانی جماعت کی تصنیفات کا براہِ راست اور بجائے خود مطالعہ کیا۔ پھر بھی اس جلیل القدر کتاب سے بہت سے قادیانی مآخذ کا علم ہوا اور یکجا بہت سے معلومات حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی دینی حمیت اور علمی خدمت قبول فرمائے اور اُن کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ابوالحسن علی

لاہور　　　　جمعہ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ

باب اوّل

تحریک کا زمانہ اور ماحول اور اس کی بنیادی و مرکزی شخصیتیں

فصلِ اوّل

انیسویں صدی عیسوی کا ہندوستان

انیسویں صدی عیسوی تاریخ میں اس لحاظ سے خاص امتیاز رکھتی ہے کہ اسلامی ممالک میں دماغی بے چینی اور اصولی کشمکش اپنے شباب کو پہنچ چکی تھی۔ ہندوستان اس بے چینی و کشمکش کا خاص میدان تھا۔ یہاں بیک وقت مغربی و مشرقی تہذیبیں، جدید و قدیم نظامِ تعلیم اور نظامِ فکر اور اسلام و مسیحیت میں معرکہ کارزار گرم تھا اور دونوں طاقتیں زندگی کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما تھیں۔

۱۸۵۷ء کی آزادی کی کوشش ناکام ہو چکی تھی، ہندوستان کے مسلمانوں کے دل شکست کے صدمے سے زخمی اور ان کا دماغ ناکامی کی چوٹ سے مفلوج ہو رہا تھا۔ وہ دوہری غلامی کے خطرہ سے دوچار تھے، سیاسی غلامی اور تہذیبی غلامی ایک طرف زرخیز فاتح انگریزی سلطنت نے نئی تہذیب و ثقافت کی ترویج و اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے عیسائی پادری مسیحیت کی دعوت و تبلیغ میں خاص سرگرمی دکھا رہے تھے۔ وہ عقائد میں تزلزل پیدا کر دینے اور عقیدہ اور شریعت اسلامی کے ماخذوں اور سرچشموں کے بارے میں تشکک اور بدگمانی پیدا کر دینے کو اپنی بڑی کامیابی سمجھتے

تھے۔ مسلمانوں کی نئی نسل جس پر اسلامی تعلیمات نے پورے طور پر اثر نہیں کیا تھا۔ اس صورت حال کا خاص طور پر ہدف اور اسکول و کالج اس ذہنی انتشار اور اندرونی کشمکش کا خصوصیت کے ساتھ میدان تھے۔ ہندوستان میں قبولِ مسیحیت کے واقعات بھی پیش آنے لگے لیکن اس وقت کا اصل مسئلہ اور اسلام کے لیے صحیح خطرہ ارتداد نہ تھا، بلکہ الحاد اور عقائد میں تردد و تزلزل تھا۔ عیسائی پادریوں اور مسلمان عالموں میں جابجا مناظرے اور مباحثے ہوتے جن میں عام طور پر علمائے اسلام کو فتح ہوئی اور عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کا علمی اور عقلی تفوق اور استحکام ثابت ہوا، لیکن اس سب کے نتیجہ میں بہرحال طبیعتوں میں ایک بے چینی اور افکار و عقائد میں تزلزل پیدا ہو رہا تھا۔

دوسری طرف فرقِ اسلامیہ کا آپس کا اختلاف تشویشناک صورت اختیار کر گیا تھا ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی تردید میں سرگرم اور کمربستہ تھا۔ مذہبی مناظروں اور مجادلوں کا بازار گرم تھا، جن کے نتیجہ میں اکثر زد و کوب، قتل و قتال اور عدالتی چارہ جوئیوں کی نوبت آتی۔ سارے ہندوستان میں ایک مذہبی خانہ جنگی سی برپا تھی، اس صورتِ حال نے بھی ذہنوں میں انتشار، تعلقات میں کشیدگی اور طبیعتوں میں بیزاری پیدا کر دی تھی اور علماء کے وقار اور دین کے احترام کو بڑا صدمہ پہنچا تھا۔

دوسری طرف خام صوفیوں اور جاہل دلق پوشوں نے طریقت و ولایت کو بازیچۂ اطفال بنا رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے "شطحیات[1]" و الہامات کی بڑے پیمانے پر اشاعت کی تھی۔ جابجا لوگ الہام کا دعویٰ اور عجیب غریب خوارق اور بشارتوں کی

---

[1] وہ کلمات و ملفوظات جو صوفیہ سے غلبۂ حال اور سُکر میں صادر ہوتے ہیں۔

روایت کرتے پھرتے تھے۔ اس کے اثر سے عوام میں اسرار و رموز، خوارق و کرامات اور غیبی اطلاعات، خوابوں اور پیش گوئیوں کے سننے کا غیر معمولی شوق پیدا ہو گیا تھا، جو شخص یہ جنس جتنی زیادہ پیش کرتا تھا اتنا ہی وہ عوام میں مقبول ہوتا اور ان کی عقیدت و احترام کا مرکز بنتا، عیار و درویشوں اور چالاک دین فروشوں نے عوام کی اس ذہنیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا طبیعتیں اور دماغ ناقابلِ فہم چیز کے قبول کرنے کے لیے ہر نئی چیز کو ماننے کے لیے، ہر دعوت و تحریک کا ساتھ دینے کے لیے اور ہر روایت و افسانے کی تصدیق کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔

مسلمانوں پر عام طور پر یاس و نا امیدی اور حالات و ماحول سے شکست خوردگی کا غلبہ تھا، بعض علماء کی جد و جہد کے انجام اور مختلف دینی اور عسکری تحریکوں کی ناکامی کو دیکھ کر معتدل اور معمولی ذرائع اور طریقۂ کار سے انقلابِ حال اور اصلاح سے لوگ مایوس ہو چلے تھے اور عوام کی بڑی تعداد کسی مردِ غیب کے ظہور اور کسی ملہم اور مؤید من اللہ کی آمد کی منتظر تھی۔ کہیں کہیں یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا تھا کہ تیرھویں صدی کے اختتام پر مسیح موعود کا ظہور ضروری ہے، مجلسوں میں زمانہ آخر کے فتنوں اور واقعات کا چرچا تھا، شاہ نعمت اللہ ولی کشمیری کے طرز کی پیش گوئیوں اور الہامات سے سہارا حاصل اور غم غلط کیا جاتا تھا، خواب، فالوں اور غیبی اشاروں میں تسکین کی کشش تھی اور وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے لیے مومیائی کا کام دیتے تھے۔

پنجاب ذہنی انتشار و بے چینی، ضعیف الاعتقادی اور دینی ناواقفیت کا

خاص مرکز تھا۔ ہندوستان کا یہ علاقہ اسّی برس تک مسلسل سکھ حکومت کے مصائب برداشت کر چکا تھا جو ایک طرح کی مطلق العنان فوجی حکومت تھی۔ ایک صدی سے کم کے اس عرصہ میں پنجاب کے مسلمانوں کے عقائد میں تزلزل اور دینی حمیت میں خاصا ضعف آچکا تھا۔ صحیح اسلامی تعلیم عرصہ سے مفقود تھی۔ اسلامی زندگی اور معاشرہ کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں —— دماغوں اور طبیعتوں میں انتشار و پراگندگی تھی اور مختصراً اقبال کے الفاظ میں ؎

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

اس صورتِ حال نے پنجاب کو ذہنی بغاوت اور ایک ایسی جدّت پسند تحریک و دعوت کے سرسبز و کامیاب ہونے کے لیے موزوں ترین میدان بنا دیا تھا جس کی بنیاد تاویلات و الہامات پر ہو۔ قوم کے بڑے حصہ کا مزاج وہ بن گیا تھا جس کو اقبال نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے ؎

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت — کرلے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا — ہو کھیل مُریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے — یہ شاخِ نشیمن سے اُترتا ہے بہت جلد[1]

اس اُنیسویں صدی کا اختتام تھا کہ مرزا غلام احمد صاحب اپنی نئی دعوت و تحریک کے ساتھ منظرِ عام پر آئے، ان کو اپنی دعوت اور اپنے تحریک کے لیے اور

---

[1] ضربِ کلیم۔

بلند ارادوں کی تکمیل کے لیے مناسب زمانہ اور مناسب جگہ ملی۔ طبیعتوں کی عام بے چینی عوام کی عجائب پرستی، مستقل ذرائع اصلاح و انقلاب سے مایوسی، علماء کے وقار و جمعیت کا زوال و تنزل، مذہبی بحثوں کی گرم بازاری اور اس کے نتیجہ میں عامیانہ فرقہ بندی اور طبیعتوں کی آزادی، اس تحریک کے لیے معاون اور سازگار ثابت ہوئی۔ دوسری طرف حکومتِ وقت نے (جو مجاہدین کی تحریک سے زک اٹھا چکی تھی اور مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور جوشِ مذہبی سے پریشان و ہراساں رہتی تھی) اس تحریک کا خیر مقدم کیا جس نے حکومتِ برطانیہ کے ساتھ وفاداری اور اخلاص کو اپنے بنیادی عقائد اور مقاصد میں شامل کیا تھا اور جس کے بانی کا حکومت کے ساتھ قدیم اور غیر مشتبہ تعلق تھا، ان تمام عناصر و اسباب نے مل کر وہ مناسب و معاون ماحول فراہم کیا جس میں یہ تحریک وجود میں آئی اور اس نے اپنے پیرو اور ہم خیال پیدا کر لیے اور ایک مستقل فرقہ کی بنیاد پڑ گئی۔

اسی تحریک کے ظہور اور ارتقاء اس کے مزاج و نظام، اس کے نتائج و اثرات اور اس کی دینی و تاریخی حیثیت پر ہم آئندہ صفحات میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

فصل دوم

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی[1]

نسب اور خاندان مرزا صاحب کا نسبی تعلق مغل قوم اور اس کی خاص شاخ برلاس سے ہے۔ کتاب البریہ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں: ہماری قوم مغل برلاس ہے[2]۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کو بذریعۂ الہام معلوم ہوا کہ وہ ایرانی الاصل ہیں۔ اسی کتاب کے حاشیہ پر وہ لکھتے ہیں:

"الہام میری نسبت یہ ہے لو کان الایمان معلقا بالثریا لناله رجل من فارس[3]۔ یعنی اگر ایمان ثریا سے معلق ہوتا تو یہ مرد جو فارسی الاصل ہے وہ جا کر اس کو لے لیتا۔ اور پھر ایک تیسرا الہام میری نسبت یہ ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا رَدَّ عَلَیْھِمْ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ شَکَرَ اللّٰہُ سَعْیَہٗ۔ یعنی جو لوگ کافر ہوئے اس مرد نے جو فارسی الاصل ہے ان کے مذہب کو رد کر دیا۔ خدا اس کی کوشش کا شکر گزار ہے۔ یہ تمام الہامات ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارے آباء اوّلین فارسی تھے۔ وَالْحَقُّ مَا اَظْهَرَهُ اللّٰهُ۔"[4]

---

[1] مرزا صاحب کے حالات زندگی کے سلسلہ میں ہم نے خود مرزا صاحب یا خاندان کے معتبر افراد کی تحریروں پر [illegible] زندگی کے سلسلہ میں اس کتاب کا سب سے بڑا ماخذ ان کے صاحبزادے مرزا بشیر احمد صاحب کی تصنیف سیرۃ المہدی اور قادیانی جماعت کی دوسری مستند کتابیں ہیں۔ [2] کتاب البریہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴ [3] یہ حدیث صحاح میں ہے [illegible] ۱۳۵ [4] کتاب البریہ حاشیہ صفحہ ۱۳۵

نیز اربعین میں لکھتے ہیں:[1]

یاد رہے کہ اس خاکسار کا خاندان بظاہر مغلیہ خاندان ہے، کوئی تذکرہ ہمارے خاندان کی تاریخ میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ وہ بنی فارس کا خاندان تھا، ہاں بعض کاغذات میں یہ دیکھا گیا کہ ہماری بعض دادیاں شریف اور مشہور سادات میں سے تھیں، اب خدا کے کلام سے معلوم ہوا کہ دراصل ہمارا خاندان فارسی خاندان ہے، سو اس پر ہم پورے یقین سے ایمان لاتے ہیں کیونکہ خاندانوں کی حقیقت جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کسی دوسرے کو ہرگز معلوم نہیں اسی کا علم صحیح اور یقینی اور دوسرے کا شکی اور ظنی ہے۔[1]

مرزا صاحب کے پردادا مرزا گل محمد صاحب جائداد و املاک تھے اور پنجاب میں ان کی اچھی خاصی ریاست تھی۔ مرزا صاحب نے ان کی رئیسانہ شان، تزک و احتشام ان کے وسیع دسترخوان اور ان کے دینی اثرات کو تفصیل سے لکھا ہے۔[2] ان کے انتقال کے بعد اس ریاست کو زوال آیا اور سکھ ریاست کے دیہاتوں پر قابض ہو گئے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب کے دادا مرزا عطا محمد صاحب کے پاس صرف قادیان رہ گیا آخر میں سکھوں نے اس پر بھی قبضہ کر لیا اور مرزا صاحب کے خاندان کو قادیان سے نکال دیا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے آخر زمانہ میں مرزا صاحب کے والد مرزا غلام مرتضیٰ قادیان واپس آ گئے اور مرزا صاحب موصوف کو اپنے والد صاحب کے علاقہ میں پانچ گاؤں واپس ملے۔[3]

---

[1] اربعین حاشیہ صفحہ ۱۰ [2] ملاحظہ ہو حاشیہ کتاب البریہ صفحہ ۱۳۴ تا ۱۴۲

[3] ملاحظہ ہو حاشیہ کتاب البریہ صفحہ ۱۴۲ تا ۱۴۳۔

مرزا صاحب کا خاندان انگریزی حکومت سے جو پنجاب میں نئی نئی قائم ہوئی تھی شروع سے وفادارانہ و مخلصانہ تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان کے متعدد افراد نے اس نئی حکومت کی ترقی اور اس کے استحکام میں جاں بازی اور جاں نثاری سے کام لیا تھا اور بعض نازک موقعوں پر اس کی مدد کی تھی، مرزا صاحب کتاب البریہ کے شروع میں "اشتہار واجب الاظہار" میں لکھتے ہیں :

"میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا، جن کو دربارِ گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ رئیسانِ پنجاب میں ہے اور ۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکارِ انگریزی کو مدد دی تھی، یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانۂ غدر کے وقت سرکارِ انگریزی کی امداد میں دیئے تھے۔ ان خدمات کی وجہ سے جو چٹھیات خوشنودیٔ حکام اُن کو ملی تھیں، مجھے افسوس ہے کہ بہت سی اُن میں سے گم ہو گئیں مگر تین چٹھیات جو مدت سے چھپ چکی ہیں، اُن کی نقلیں حاشیہ میں درج کی گئی ہیں۔ پھر میرے دادا صاحب کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدماتِ سرکاری میں مصروف رہا اور جب تموں کے گذر پر مفسدوں کا سرکارِ انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکارِ انگریزی کی طرف سے

لڑائی میں شریک تھا[1]

پیدائش، تعلیم و تربیت

مرزا صاحب سکھ حکومت کے آخری عہد ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں ضلع گورداسپور کے قصبہ قادیان میں پیدا ہوئے۔[2] خود اُن کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے وقت وہ سولہ سترہ برس کے تھے۔[3]

مرزا صاحب نے اپنے گھر ہی پر متوسطات تک تعلیم پائی۔ انھوں نے مولوی فضل الٰہی، مولوی فضل احمد اور مولوی گل علی شاہ صاحب سے نحو اور منطق و حکمت کی کتابیں پڑھیں۔ طب کی کتابیں اپنے والد صاحب سے پڑھیں جو ایک حاذق طبیب تھے۔ مرزا صاحب کو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں کتابوں کے مطالعہ میں بڑا انہماک تھا۔ وہ لکھتے ہیں: "ان دنوں میں مجھے کتابوں کے دیکھنے کی طرف اس قدر توجہ تھی گویا میں دنیا میں نہ تھا۔ میرے والد صاحب مجھے بار بار یہی ہدایت کرتے تھے کہ کتابوں کا مطالعہ کم کرنا چاہیے، کیونکہ وہ نہایت ہمدردی سے ڈرتے تھے کہ صحت میں فرق نہ آوے"[4]۔ یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہا اور مرزا صاحب کو اپنے والد کے اصرار سے آبائی زمینداری کے حصول کے لیے جد و جہد اور عدالتی کارروائیوں

---

[1] "اشتہار واجب الاظہار" مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۹۷ء (صفحہ ۳) ملحق بکتاب البریہ۔ [2]، [3] حاشیہ کتاب البریہ صفحہ ۱۴۶؛ مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے اپنے اس رسالہ میں جو ولیعہد سلطنت برطانیہ کو ۱۹۲۲ء میں پیش کیا تھا، مرزا صاحب کا سن ولادت ۱۸۳۶ء لکھا ہے (صفحہ ۲۹) اس حساب سے ۱۹۰۸ء میں انکی عمر ۷۲ سال کی ہوتی ہے یہ ترمیم غالباً اس خیال کے ماتحت کی گئی ہے کہ مرزا صاحب کی یہ پیشگوئی پوری ہو جائے جو انھوں نے الہام الٰہی کے طور پر اربعین میں درج کی ہے۔ "شیئاً من ذلک حیوۃ طیبۃ ثمانین حولاً او قریباً من ذلک" ہم تجھے ایک پاک اور آرام کی زندگی عطا کریں گے اسی برس یا اس کے قریب قریب (اربعین نمبر ۳ صفحہ ۳۹)۔ [4] کتاب البریہ صفحہ ۱۵۰

میں مصروف ہونا پڑا، وہ لکھتے ہیں مجھے افسوس ہے کہ بہت سا وقت عزیز میرا ان جھگڑوں میں ضائع ہوا اور اس کے ساتھ ہی والد صاحب موصوف نے زمینداری امور کی نگرانی میں مجھے لگا دیا۔ میں اس طبیعت اور فطرت کا آدمی نہیں تھا۔[1]

ملازمت اور مشغولیت

مرزا صاحب نے سیالکوٹ شہر میں ڈپٹی کمشنر کی کچہری میں قلیل تنخواہ پر ملازمت کر لی تھی۔ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء تک چار سال اس ملازمت میں رہے۔[2] دوران ملازمت میں انھوں نے انگریزی کی بھی ایک دو کتابیں پڑھیں۔[3] اسی زمانہ میں انھوں نے مختاری کا امتحان دیا لیکن اس میں ناکامیاب رہے۔[4] ۱۸۶۸ء میں وہ اس ملازمت سے استعفا دے کر قادیان آگئے اور بدستور زمینداری کے کاموں میں مشغول ہو گئے، مگر اکثر حصہ وقت کا قرآن شریف کے تدبر اور تفسیروں اور حدیثوں کے دیکھنے میں صرف ہوتا تھا۔[5]

اخلاق و اوصاف

مرزا صاحب بچپن ہی سے بہت سادہ لوح تھے۔ دنیا کی چیزوں سے ناواقفیت اور استغراقی کیفیت شروع ہی سے ان میں نمایاں تھی۔ ان کو گھڑی میں چابی دینا نہیں آتا تھا۔[6] جب وقت دیکھنا ہوتا تھا تو گھڑی نکال کر ایک کے ہندسہ یعنی عدد سے گن کر وقت کا پتہ لگاتے تھے اور انگلی رکھ رکھ کر ہندسے گنتے تھے اور منہ سے بھی گنتے جاتے تھے

---

[1] کتاب البریہ صفحہ ۱۵۱ [2] سیرۃ المہدی حصہ اول صفحہ ۴۳ [3] ایضاً صفحہ ۱۵۵ [4] ایضاً صفحہ ۱۵۶
[5] حاشیہ کتاب البریہ صفحہ ۱۵۱ [6] "یادِ ایام" از قاضی محمد ظہور الدین اکمل قادیانی مندرجہ اخبار الحکم جوبلی خاص نمبر ۲۱ مئی ۱۹۳۴ء ماخوذ از "قادیانی مذہب"۔

گھڑی دیکھتے ہی وقت نہ پہچان سکتے تھے۔[1] فرطِ استغراق میں دائیں بائیں جُوتے کا امتیاز مشکل ہوتا تھا۔ مرزا بشیر احمد صاحب سیرۃ المہدی میں لکھتے ہیں: ایک دفعہ کوئی شخص آپ کے لیے گرگابی لے آیا۔ آپ نے پہن لی مگر اُس کے اُلٹے سیدھے پاؤں کا آپ کو پتہ نہیں لگتا تھا۔ کئی دفعہ اُلٹی پہن لیتے تھے اور پھر تکلیف ہوتی تھی، بعض دفعہ آپ کا اُلٹا پاؤں پڑ جاتا تو تنگ ہو کر فرماتے اُن کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ میں نے آپ کی سہولت کے واسطے اُلٹے سیدھے پاؤں کے لیے نشان لگا دیے تھے مگر باوجود اس کے آپ اُلٹا سیدھا پہن لیتے تھے۔ اس لیے آپ نے اُسے اُتار دیا۔[2] بار بار پیشاب آنے کی وجہ سے اکثر جیب میں ڈھیلے رکھتے تھے اور شیرینی سے غیر معمولی رغبت کی وجہ سے گُڑ کے ڈھیلے بھی رکھ لیا کرتے تھے۔[3]

مرزا صاحب کی صحت اور شکایتیں

مرزا صاحب کو جوانی میں ہسٹیریا کی شکایت ہو گئی تھی اور کبھی کبھی اس کا ایسا دورہ پڑتا تھا کہ بیہوش ہو کر گر جاتے تھے۔[4] مرزا صاحب کبھی اس کو ہسٹیریا اور کبھی مراق سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کو ذیابیطس اور کثرتِ بول کی بھی شکایت تھی۔ ایک جگہ یہ لکھتے ہوئے کہ "میں ایک دائم المرض آدمی ہوں" تحریر فرماتے ہیں:

"ہمیشہ سر درد، دورانِ سر اور کمی خواب اور تشنج دل کی بیماری

---

[1] سیرۃ المہدی حصہ اوّل صفحہ ۱۸۰ [2] سیرۃ المہدی حصہ اوّل صفحہ ۶۷ [3] مرزا صاحب کے حالات، مرتبہ معراج الدین عمر صاحب قادیانی شامل براہین احمدیہ جلد اوّل صفحہ ۶۷ [4] سیرۃ المہدی حصہ اوّل صفحہ ۱۳

دَورہ کے ساتھ آتی ہے اور دُوسری چادر جو میرے نیچے کے حصّۂ بدن میں ہے وُہ بیماری ذیابیطس ہے کہ ایک مدت سے دامنگیر ہے اور بسا اوقات سَو سَو دفعہ رات کو یا دن کو پیشاب آتا ہے اور اِس قدر کثرتِ پیشاب سے جس قدر عوارضِ ضعف وغیرہ ہوتے ہیں وُہ سب میرے شاملِ حال رہتے ہیں۔[1]

مرزا صاحب نے اپنی جوانی میں مجاہدات اور چلہ کشی بھی کی اور مسلسل روزے بھی رکھے۔ انھوں نے ایک طویل چلہ کیا جس میں برابر چھ ماہ تک روزے رکھے۔[2] انھوں نے ۱۸۸۶ء میں ہوشیار پور میں ایک چلہ کھینچا۔[3] آخر میں خرابی صحت اور کمزوری کی وجہ سے ان مجاہدات کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔ ۲۱ مارچ ۱۸۹۱ء کے خط میں حکیم نور الدین صاحب کو لکھتے ہیں: "اب طبیعت تحمّلِ شدائد مجاہدات نہیں رکھتی اور ادنیٰ وجہ کی محنت اور خوض و توجہ سے جلد بگڑ جاتی ہے۔"[4]

مرجعیت اور فارغ البالی

مرزا صاحب نے اپنی زندگی عسرت و تنگی اور ایک معمولی حیثیت سے شروع کی، لیکن جب دعوت و تحریک نے فروغ پایا اور وُہ ایک کثیر التعداد اور مرفّہ الحال فرقے کے رُوحانی پیشوا اور مقتدا ہو گئے تو اُن کو پوری فارغ البالی حاصل ہو گئی اور وُہ امیرانہ زندگی گزارنے لگے۔ ان کو خود بھی اس انقلاب اور ابتدائی اور آخری زندگی کے

---

[1] ضمیمہ اربعین صفحہ ۳ و ۴، صفحہ ۴ باختصار [2] سیرۃ المہدی حصہ اوّل صفحہ ۶، [3] ایضاً صفحہ ۷، [4] مکتوبات احمدیہ جلد پنجم عدد ۲ صفحہ ۱۰۳

فصل سوم

حکیم نور الدین صاحب بھیروی

مذہب و تحریک قادیانیت کی تاریخ میں اہمیت و مرکزیت کے لحاظ سے مرزا صاحب کے بعد حکیم نور الدین صاحب بھیروی ہی کا درجہ ہے۔ بعض اہلِ نظر کا خیال ہے کہ حکیم صاحب اس پورے سلسلے میں دماغ کا درجہ رکھتے ہیں اور اس تحریک و نظام کا علمی و فکری سرچشمہ اُن کی ذات ہے۔

نشو و نما اور تعلیم

حکیم نور الدین صاحب[1] ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۱ء) میں بھیرہ (ضلع سرگودھا سابق شاہ پور پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اس حساب سے ۱۸۵۶ء میں وہ سولہ برس کے جوان تھے اور مرزا صاحب سے ایک ہی دو سال چھوٹے تھے۔ ان کے والد حافظ غلام رسول صاحب بھیرہ کی ایک مسجد میں امام تھے۔ اُن کی سوانح میں بتایا گیا ہے کہ وہ نسباً فاروقی ہیں۔

اُن کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ہوئی۔ اپنی والدہ صاحبہ سے پنجابی زبان میں

---

[1] حکیم صاحب کے حالات "مرقاۃ الیقین فی حیاۃ نور الدین" مصنفہ اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی سے ماخوذ ہیں۔ یہ حالات حکیم صاحب کے خود سنائے ہوئے ہیں۔ اکبر شاہ خاں صاحب (صاحب تصنیفات کثیرہ) نے جو اُس وقت حکیم صاحب کے مرید اور ان کے شاگرد رشید تھے قلمبند کر لیے تھے۔

اس تفاوت کا احساس تھا۔ ۱۹۰۷ء میں ایک موقع پر اپنی اس ابتدائی حالت اور موجودہ حالت کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہماری معاش اور آرام کا تمام مدار ہمارے والد صاحب کی محض ایک مختصر آمدنی پر منحصر تھا اور بیرونی لوگوں میں ایک شخص بھی نہیں جانتا تھا اور میں ایک گمنام انسان تھا جو قادیان جیسے ویران گاؤں میں زاویہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا پھر بعد اس کے خدا نے اپنی پیشگوئی کے موافق ایک دنیا کو میری طرف رجوع دے دیا اور ایسی متواتر فتوحات سے ہماری مدد کی کہ جس کا شکریہ بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ مجھے اپنی حالت پر خیال کر کے اس قدر بھی اُمید نہیں تھی کہ دس روپیہ ماہوار بھی آئیں گے مگر خدا تعالیٰ جو غریبوں کو خاک میں سے اُٹھاتا اور متکبروں کو خاک میں ملاتا ہے۔ اس نے ایسی میری دستگیری کی کہ میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ اب تک تین لاکھ کے قریب روپیہ آچکا ہے اور شاید اس سے زیادہ ہو۔"[1]

اس کے نیچے حاشیے پر لکھتے ہیں۔

"اگرچہ منی آرڈروں کے ذریعہ ہزار ہا روپے آچکے ہیں مگر اس سے زیادہ وہ ہیں جو خود مخلص لوگوں نے آکر دیے اور جو خطوط کے

---

[1] حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۱۱

اندر نوٹ آتے اور بعض مخلصوں نے نوٹ یا سونا اس طرح بھیجا جو اپنا نام بھی ظاہر نہیں کیا اور مجھے اب تک معلوم نہیں کہ ان کے نام کیا کیا ہیں[1]۔"

نکاح اور اولاد

مرزا صاحب نے ۱۸۵۲ء یا ۱۸۵۳ء میں پہلا نکاح اپنے خاندان میں کیا[2]۔ ان بی بی سے دو صاحبزادے مرزا سلطان احمد، مرزا فضل احمد ہوئے تھے۔ ان بی بی کو ۱۸۹۱ء میں انھوں نے طلاق دے دی تھی۔ اُن کی دوسری شادی ۱۸۸۴ء میں دہلی میں نواب ناصر کی صاحبزادی سے ہوئی[3]۔ مرزا صاحب کی بقیہ اولاد انھیں کے بطن سے ہے۔ ان سے تین صاحبزادے ہیں، مرزا بشیر الدین محمود، مرزا بشیر احمد (مصنف سیرۃ المہدی) اور مرزا شریف احمد۔

وفات

مرزا غلام احمد صاحب نے جب ۱۸۹۱ء میں مسیحِ موعود ہونے کا دعویٰ کیا[4] پھر ۱۹۰۱ء میں نبوت کا دعویٰ کیا[5] تو علمائے اسلام نے ان کی تردید و مخالفت شروع کی۔ تردید و مخالفت کرنے والوں میں مشہور عالم مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مدیر "اہل حدیث" پیش پیش اور نمایاں تھے۔ مرزا صاحب نے ۵؍اپریل ۱۹۰۷ء میں ایک اشتہار جاری کیا جس میں مولانا کو مخاطب

---

[1] حقیقۃ الوحی حاشیہ صفحہ ۲۱۱ [2] سیرۃ المہدی حصّہ دوم صفحہ ۱۵۰ [3] سیرۃ المہدی حصّہ دوم صفحہ ۱۵۱
[4] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو باب ثانی فصل دوم [5] ملاحظہ ہو باب ثانی فصل سوم

کرتے ہوئے تحریر فرمایا :

"اگر میں ایسا ہی کذاب و مفتری ہوں جیسا کہ اکثر اوقات آپ اپنے ہر ایک پرچہ میں مجھے یاد کرتے ہیں تو میں آپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مفسد اور کذاب کی بہت عمر نہیں ہوتی اور آخر وہ ذلت و حسرت کے ساتھ اپنے اشد دشمنوں کی زندگی میں ہی ناکام ہلاک ہو جاتا ہے اور اس کا ہلاک ہونا ہی بہتر ہوتا ہے تا خدا کے بندوں کو تباہ نہ کرے۔

اور اگر میں کذاب و مفتری نہیں ہوں اور خدا کے مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف ہوں اور مسیح موعود ہوں تو میں خدا کے فضل سے امید رکھتا ہوں کہ سنت اللہ کے موافق آپ مکذبین کی سزا سے نہیں بچیں گے پس اگر وہ سزا جو انسان کے ہاتھوں سے نہیں بلکہ خدا کے ہاتھوں سے ہے یعنی طاعون ہیضہ وغیرہ مہلک بیماریاں آپ پر میری زندگی میں وارد نہ ہوئیں[1] تو میں خدا کی طرف سے نہیں۔"[2]

اس اشتہار کے ایک سال بعد ۲۵ مئی ۱۹۰۸ء کو مرزا صاحب بمقام لاہور بعد عشاء اسہال میں مبتلا ہوئے۔ اسہال کے ساتھ استفراغ بھی تھا۔ رات ہی کو علاج کی تدبیر کی گئی لیکن ضعف بڑھتا گیا اور حالت دگرگوں ہو گئی بالآخر ۲۶ مئی

---

[1] مولانا ثناء اللہ نے مرزا صاحب کی وفات کے پورے چالیس برس بعد ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء میں اسی برس کی عمر میں وفات پائی۔

[2] تبلیغ رسالت جلد دہم صفحہ ۱۲۰

سہ شنبہ کو دن چڑھے آپ نے انتقال کیا۔ مرزا صاحب کے خسر میر ناصر نواب صاحب کا بیان ہے:

"حضرت مرزا صاحب جس رات کو بیمار ہوئے۔ اس رات کو میں اپنے مقام پر جا کر سو چکا تھا، جب آپ کو بہت تکلیف ہوئی تو مجھے جگایا گیا تھا۔ جب میں حضرت صاحب کے پاس پہنچا، تو آپ نے مجھے خطاب کر کے فرمایا میر صاحب! مجھے وبائی ہیضہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے کوئی ایسی صاف بات میرے خیال میں نہیں فرمائی، یہاں تک کہ دوسرے دن دس بجے کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔"[1]

نعش قادیان لے جائی گئی۔ ۲۷ مئی ۱۹۰۸ء کو تدفین عمل میں آئی حکیم نورالدین صاحب بھیروی خلیفہ اور جانشین مقرر ہوئے۔

---

[1] حیات ناصر مرتبہ شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی۔

اور شورش پیدا ہوئی۔ حکیم صاحب کی طبیعت میں لوگوں کی جہالت اور جمود و تعصب اور اپنے علمی تفوق اور تبحر کا احساس پیدا ہوا۔ اسی دوران میں وہ دہلی بھی گئے جہاں لارڈ لٹن کا دربار ہو رہا تھا۔ وہاں منشی جمال الدین خاں صاحب، مدار المہام بھوپال سے دوبارہ ملاقات ہوئی اور وہ اپنے ساتھ ان کو بھوپال لے آئے۔ کچھ عرصہ وہ وہاں قیام کر کے وطن واپس آئے اور بھیرہ میں مطب شروع کر دیا۔ ان کی حذاقت اور کمال فن کا شہرہ سن کر مہاراجہ جموں نے ان کو اپنا طبیب خاص مقرر کر لیا اور انھوں نے ایک عرصہ تک جموں، پونچھ اور کشمیر کے والیانِ ریاست کی خدمت کی۔ حکیم صاحب نے اپنی طبی مہارت، طلاقت لسانی اور علم و ذکاوت سے ریاست میں بڑا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا اور وہ ریاست کے امور اور مہاراجہ کے مزاج میں خاصے دخیل ہو گئے تھے۔

مرزا صاحب سے تعارف و تعلق

جموں کے زمانۂ قیام ہی میں حکیم صاحب کا مرزا غلام احمد صاحب سے تعارف ہوا، جو بسلسلۂ ملازمت سیالکوٹ میں مقیم تھے، غالباً بھیرہ آتے جاتے۔ وہ سیالکوٹ سے گزرتے تھے اور ہم مذاقی اور طبعی مناسبت کی وجہ سے وہ مرزا صاحب سے ملتے ہوئے جاتے تھے[1]۔ یہ تعارف و ملاقات بہت جلد دوستی میں تبدیل ہو گئی اور دونوں ایک دوسرے کے ہمدم و ہمراز بن گئے[2]۔ جب مرزا صاحب

---

[1] دونوں کو مذاہب غیر کے مطالعہ اور آریہ سماج و عیسائیوں کی تردید و مناظرہ کا شوق تھا۔

[2] ملاحظہ ہو مکتوبات احمدیہ جلد پنجم خطوط بنام حکیم صاحب۔

فقہ کی کتابیں پڑھیں، پھر بچپن میں لاہور گئے۔ وہاں منشی محمد قاسم کشمیری سے فارسی اور مرزا امام ویردی سے کچھ خوش خطی سیکھی مگر ان دونوں چیزوں سے اُنھیں کچھ دلچسپی نہیں ہوئی۔ یہ دونوں اُستاد شیعہ تھے۔ ۱۲۷۰ھ میں وُہ وطن واپس آئے اور اُنھوں نے کچھ عرصہ تک میاں حاجی شرف الدین سے کچھ پڑھا۔ اسی زمانہ میں باضابطہ عربی کی تعلیم شروع ہوئی۔ حضرت سید احمد صاحبؒ کے مجاہدین سے تعلق رکھنے والے ایک تاجر کتب کے اثر و صحبت سے اُن کو ترجمۂ قرآن کا شوق ہوا اور اُنھوں نے تقویۃ الایمان اور مشارق الانوار شوق سے پڑھیں کچھ عرصہ کے بعد لاہور آ کر کسی قدر علم طب کی تحصیل کی۔ ابھی ابتدائی تعلیم ہی تھی کہ ۱۸۵۸ء میں اُنھوں نے راولپنڈی کے نارمل اسکول میں ملازمت کر لی۔ خود فارسی پڑھاتے تھے اور ایک ماسٹر سے حساب و جغرافیہ پڑھتے تھے۔ ایک تحصیلی امتحان میں کامیابی حاصل کر کے قصبہ پنڈ دادن خاں میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور عربی کی تعلیم دوبارہ شروع کی۔ چار برس کے بعد ملازمت سے تعلق جاتا رہا اور وُہ پورے طور پر اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ کچھ عرصہ مولوی احمد الدین صاحب سے (جو بگے والے قاضی صاحب کے نام سے مشہور تھے) پڑھا، پھر شوقِ علم میں ہندوستان کا سفر کیا اور رام پور میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، وہاں مشکوٰۃ مولانا حسن شاہ صاحب سے، شرحِ وقایہ مولوی عزیز اللہ صاحب افغانی سے، اصول الشاشی و میبذی مولانا ارشاد حسین صاحب سے، دیوانِ متنبّی

مولوی سعد اللہ صاحب سے، صدرا وغیرہ مولوی عبد العلی صاحب سے پڑھیں منطق کی منتہیانہ کتابیں میر زاہد رسالہ و میر زاہد ملا جلال بھی بے دلی اور بے رغبتی سے پڑھیں، اس زمانہ میں حکیم صاحب کو مولانا اسمٰعیل شہید کی حمایت کا بڑا جوش تھا اور کبھی وُہ اپنے اساتذہ سے بڑی بے باکی اور دلیری سے گفتگو کرتے تھے۔ رام پور سے حکیم صاحب لکھنؤ آئے اور وہاں کے ایک نامی طبیب حکیم علی حسین صاحب سے طب کی تعلیم شروع کی۔ حکیم صاحب نے جب نواب کلب علی خاں مرحوم کی طلبی پر رامپور کا قصد کیا تو وُہ بھی ساتھ گئے۔ رامپور کے دَوران قیام میں انھوں نے مفتی سعد اللہ صاحب سے مزید ادب کی تعلیم حاصل کی۔ حکیم نور الدین صاحب حکیم علی حسین صاحب لکھنوی کی صحبت و خدمت میں مجموعی طور پر دو برس رہے۔ رامپور سے عربی کی تکمیل اور درس حدیث کے شوق میں وُہ بھوپال آئے جو اس وقت رئیسۂ بھوپال کی قدردانی اور نامی گرامی علماء کے اجتماع کی وجہ سے ایک بڑا علمی مرکز بن گیا تھا، وہاں منشی جمال الدین خاں صاحب مدار المہام نے اُن کی سرپرستی کی اور اپنے پاس ٹھیرایا، بھوپال میں انھوں نے مولانا مفتی عبد القیوم صاحب (فرزند مولانا عبد الحی صاحب بڈھانوی خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ) سے بخاری اور ہدایہ کا درس لیا۔ بھوپال سے انھوں نے تکمیل علم اور حصول سعادت کی نیت سے حرمین شریفین کا

قصد کیا۔[1]

حکیم صاحب نے مکہ معظمہ میں شیخ محمد خزرجی سے ابو داؤد، سید حسین سے صحیح مسلم اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی (صاحب اظہار الحق) سے مسلّم الثبوت پڑھنا شروع کیا۔ بعض مرتبہ اساتذہ سے مباحثہ ہوتا تھا اور ان کا عدم تقلید کا رجحان اور اپنی رائے اور فہم پر اعتماد و اصرار کا اظہار ہوتا تھا۔[2]

حکیم صاحب نے ابو داؤد، ابن ماجہ شیخ محمد خزرجی سے ختم کیں۔ اسی دوران میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مکہ معظمہ تشریف لائے۔ شاہ صاحب جب مدینہ منورہ واپس گئے تو حکیم صاحب بھی مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعتِ سلوک کی اور چھ مہینے ان کی خدمت میں ٹھیر کر استفادہ کیا۔

قیامِ وطن اور ملازمت

حکیم صاحب حج و زیارت سے فارغ ہو کر اپنے وطن بھیرہ واپس آئے اور یہاں کچھ عرصہ قیام کیا، اس دوران میں عمل بالحدیث اور رسوم مروجہ کے سلسلے میں ان کے اور اہلِ شہر کے درمیان بحث و مباحثہ اور رد و کد ہوئی اور اس کے نتیجہ میں شہر میں ایک عام برہمی

---

[1] یہاں پر یہ لطیفہ قابلِ شنید ہے جو حکیم صاحب نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے خود سنایا کہ انھوں نے مفتی عبدالقیوم صاحب سے چلتے وقت عرض کیا کہ مجھے وصیت کیجیے۔ مفتی صاحب نے فرمایا: "خدا نہ بننا اور رسول نہ بننا۔" مفتی صاحب نے اس کی تشریح کی کہ خدا نہ بننے سے مراد یہ ہے کہ اگر تمھاری کوئی خواہش پوری نہ ہو تو تم کبیدہ خاطر نہ ہونا اس لیے کہ فعّال لما یرید خدا ہی کی صفت ہے اور اگر کوئی تمھارا فتویٰ نہ مانے تو اس کی تکفیر نہ کرنا، اس لیے کہ یہ رسول ہی کی صفت ہے کہ اس کی نافرمانی سے لوگ جہنم میں جائیں گے (مرقاۃ الیقین صفحہ ۹۵) [2] ملاحظہ ہو مرقاۃ الیقین صفحہ ۹۵ تا ۹۷۔

نے براہین احمدیہ تصنیف کی تو حکیم صاحب نے تصدیق براہین احمدیہ کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ حکیم صاحب کی مرزا صاحب سے عقیدت و شیفتگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ مرزا صاحب سے بیعت بھی ہو گئے تھے اور انھوں نے اُن کو اپنا پیر و مرشد اور امام اور مقتدا مان لیا تھا۔ حکیم صاحب کے مندرجۂ ذیل خط سے اُن کے اس گہرے تعلق اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا، مرشدنا، امامنا، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

عالیجناب، میری دُعا یہ ہے کہ ہر وقت حضور کی جناب میں حاضر رہوں اور امامِ زماں سے جس مطلب کے واسطے وہ مجدد کیا گیا ہے وہ مطالب حاصل کروں۔ اگر اجازت ہو تو میں نوکری سے استعفا دے دوں اور دن رات خدمتِ عالی میں پڑا رہوں یا اگر حکم ہو تو اس تعلق کو چھوڑ کر دُنیا میں پھروں اور لوگوں کو دینِ حق کی طرف بلاؤں اور اسی راہ میں جان دوں۔ میں آپ کی راہ میں قربان ہوں۔ میرا جو کچھ ہے، میرا نہیں ہے، آپ کا ہے۔ حضرت پیر و مرشد! میں کمال راستی سے عرض کرتا ہوں کہ میرا سارا مال و دولت اگر دینی اشاعت میں قربان ہو جائے تو میں مراد کو پہنچ گیا۔ اگر خریدار براہین کے توقفِ طبع کتاب سے مضطرب ہوں تو مجھے اجازت فرمایئے کہ یہ ادنیٰ خدمت بجا لاؤں کہ اُن کی تمام قیمت ادا کردہ اپنے پاس سے واپس

کر دوں، حضرت پیر و مرشد، نابکار و شرمسار عرض کرتا ہے اگر
منظور ہو تو میری سعادت ہے۔ میرا منشا ہے کہ براہین کے طبع کا
تمام خرچ مجھ پر ڈال دیا جائے، پھر جو کچھ قیمت میں وصول ہو وہ
روپیہ آپ کی ضروریات میں خرچ ہو۔ مجھے آپ سے نسبت
فاروقی ہے اور سب کچھ اس راہ میں فدا کرنے کے لیے تیار ہوں
دُعا فرمائیں کہ میری موت صدیقوں کی موت ہو۔"[1]

حکیم صاحب مرزا صاحب کے بارے میں ایسے راسخ الاعتقاد تھے کہ جب مرزا صاحب نے "فتح اسلام" اور "توضیح مرام" تصنیف کیں اور حکیم صاحب کو ابھی دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی، ایک شخص نے حکیم صاحب سے کہا کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے؟ حکیم صاحب نے کہا، نہیں! اس نے کہا اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کرے تو پھر؟ حکیم صاحب نے کہا تو پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ صادق و راست باز ہے یا نہیں۔ اگر صادق ہے تو بہر حال اس کی بات کو قبول کریں گے۔ حکیم صاحب نے یہ روایت خود ہی سنائی اور یہ قصہ سنا کر فرمایا: "کہ یہ تو صرف نبوت کی بات ہے، میرا تو ایمان یہ ہے کہ اگر حضرت مسیح موعود صاحب شریعت ہونے کا دعویٰ کریں اور قرآنی شریعت کو منسوخ قرار دیں تو بھی مجھے انکار نہ ہو۔ کیونکہ جب ہم نے واقعی آپ کو صادق

---

[1] مرقاۃ الیقین فی حیاۃ نور الدین صفحہ ۱۰۲، ۱۰۱

اور من جانب اللہ پایا ہے تو اب جو بھی آپ فرمائیں گے وہی حق ہوگا اور ہم سمجھیں گے کہ آیت خاتم النبیین کے کوئی اور معنی ہوں گے۔[1]

حکیم صاحب نے جموں کے تعلق ہی کے زمانہ میں مرزا صاحب کی ہدایت و تلقین سے عیسائیت کی تردید میں فصل الخطاب کے نام سے ایک کتاب چار جلدوں میں لکھی۔ وہ مرزا صاحب کی تصانیف کی طباعت و اشاعت کے مصارف میں بڑی عالی حوصلگی اور دریا دلی سے حصہ لیتے رہے اور مرزا صاحب نے بارہا ان سے بیش قرار رقمیں قرض لیں[2] اور ان کی حمیت اسلامی، نصرت دینی اور بلند ہمتی کا اعتراف کیا۔ مرزا صاحب کا ان کے بارے میں مشہور شعر ہے

"چہ خوش بودے اگر ہر یک ز امت نور دیں بودے
ہمیں بودے اگر ہر دل پُر از نور یقیں بودے"[3]

قیام قادیان و خلافت

بعض اسباب اور کارپردازان ریاست کے جوڑ توڑ سے مہاراجہ کی طبیعت حکیم صاحب سے کبیدہ اور کشیدہ ہوگئی اور ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء میں یہ تعلق ملازمت ختم ہوگیا اور حکیم صاحب اپنے وطن بھیرہ چلے آئے۔ جہاں کچھ عرصہ قیام اور مطلب کرنے کے بعد وہ مستقل طور پر قادیان منتقل ہوگئے اور انھوں نے اپنی زندگی مرزا صاحب کی حمایت اور تحریک کی دعوت و اشاعت کے لیے وقف کر دی۔

---

[1] سیرۃ المہدی صفحہ ۹۸، ۹۹ [2] مکتوبات احمدیہ جلد پنجم، خطوط بنام حکیم صاحب [3] مرقات الیقین

مرزا صاحب کی وفات (۲۶ مئی ۱۹۰۸ء) پر وہ مرزا صاحب کے خلیفہ اوّل قرار پائے۔ لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ خلیفۃ المسیح الموعود اور نورالدین اعظم ان کا خطاب ہوا۔ حکیم صاحب کو ایک مدت تک ان لوگوں کی تکفیر میں تردد تھا جو مرزا صاحب کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے تھے، لیکن پھر وہ ان کی تکفیر کے قائل ہو گئے۔[1] حکیم صاحب کی خلافت کے بارے میں کچھ تنازع بھی پیش آیا اور کچھ لوگوں نے ان کی خلافت پر سخت اعتراضات کیے۔ ایک ایسے ہی موقع پر انھوں نے ارشاد فرمایا:

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے خدا ہی نے خلیفہ بنایا، سو اب کس میں طاقت ہے کہ وہ اس خلافت کی ردا کو مجھ سے چھین لے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت نے چاہا اور اپنے مصالح سے چاہا مجھے تمھارا امام و خلیفہ بنا دیا۔ ہزار نالائقیاں مجھ پر تھوپو، مجھ پر نہیں خدا پر لگیں گی جس نے مجھے خلیفہ بنایا۔"[2]

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

"مجھے خدا نے خلیفہ بنا دیا ہے اور اب نہ تمھارے کہنے سے معزول ہو سکتا ہوں اور نہ کسی میں طاقت ہے کہ وہ معزول کرے اگر تم زیادہ زور دو گے تو یاد رکھو میرے پاس ایسے خالد بن ولید

---

[1] دیکھو کلمۃ الفصل تصنیف مرزا بشیر احمد صاحب، باب ششم
[2] رسالہ ریویو آف ریلیجنز، قادیان صفحہ ۲۳۲ جلد ۱۴ (ماخوذ از قادیانی مذہب)

ہیں جو تمہیں مرتدوں کی طرح سزا دیں گے۔"[۱]

وفات

حکیم صاحب چھ سال تک منصب خلافت پر فائز رہے۔ وہ گھوڑے سے گر کر زخمی ہوئے اور صاحب فراش ہوگئے اور اسی صدمہ سے ۱۳ مارچ ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا۔ انتقال سے چند روز پہلے اُن کی زبان بند ہو گئی تھی۔[۲] انھوں نے مرزا بشیر الدین محمود فرزند اکبر مرزا غلام احمد صاحب کو اپنا جانشین و خلیفہ منتخب کیا۔

حکیم صاحب کی شخصیت اور ذہنی مزاج

حکیم صاحب کی داستانِ زندگی پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بے چین طبیعت پائی تھی، وہ اپنی زندگی کے بڑے حصے میں ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے۔ ان میں شروع سے عقل پرستی کا رُجحان پایا جاتا تھا۔ پہلے وہ مذاہب اربعہ کی تقلید کی بندش سے آزاد ہوئے اور اس میں اُن کو خاصا غلُو رہا۔ پھر وہ سر سید احمد خاں مرحوم کے لٹریچر سے متاثر ہوئے اور اُن کے ذہن نے اُن کی تعلیمات اور اُن کے طرزِ فکر کو پورے طور پر جذب کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں سائنس اور طبیعیات کے ابتدائی معلومات اور اس کی نئی تحقیقات نئی نئی آئی تھیں اور ہندوستانی مسلمانوں کا عقلیت پسند طبقہ اُن سے بڑا متاثر ہو رہا تھا۔ جو لوگ دینی رُجحان رکھتے تھے، وہ دینی حقائق اور قرآن کے بیان و تعلیمات کو ان طبیعیاتی معلومات و تحقیقات کے ساتھ

---

۱ رسالہ تشحیذ الاذہان قادیان جلد ۹ ع۸ (ماخوذ از قادیانی مذہب) ۲ الفضل ۲۳ فروری ۱۹۳۲ء (ماخوذ از قادیانی مذہب)

منطبق کرتے اور اگر آسانی سے منطبق نہ ہو سکتیں تو قرآن مجید کی آیات اور الفاظ کی بڑی سے بڑی تاویل اور توجیہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حکیم صاحب کا درسِ تفسیر اس طرزِ فکر اور اس ذہنی رجحان کا ایک نمونہ تھا۔[1]

مرزا بشیر احمد سیرۃ المہدی میں لکھتے ہیں "حضرت نور الدین صاحب خلیفۂ اوّل بھی اوائل میں سرسیّد کے خیالات اور طریق سے بہت متاثر تھے مگر حضرت صاحب کی صحبت سے یہ اثر آہستہ آہستہ دُھلتا گیا"[2] لیکن حکیم صاحب کے خیالات کے مطالعہ اور اُن کے تلامذہ کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ خواہ سرسیّد کے اثر سے، خواہ اُفتادِ طبع سے وہ آخر تک اس طرز پر قائم رہے اور اُن کا ذہن اِس سانچہ میں پُورے طور پر ڈھل چکا تھا اور یہ اُن کا مزاج بن چکا تھا۔

حکیم صاحب کی شخصیت اور زندگی کا نفسیاتی طریقہ پر مطالعہ کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روشن خیالی اور عقلیت پسندی کے ساتھ ساتھ اُن کے اندر خوش اعتقادی اور دینی گرویدگی کا اچھا خاصا مادہ پایا جاتا تھا۔ وہ عقلیت اور عدمِ تقلید کے ساتھ ساتھ "الہامات" اور خوابوں سے بڑے متاثر ہوتے ہیں اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ روشن خیالی اور حریّتِ فکر بلکہ ذہنی بغاوت کے ساتھ

---

[1] اس کا نمونہ اُن کے حلقۂ درس کے نامور تربیت یافتہ مولوی محمد علی لاہوری کی تفسیر "بیان القرآن" اُردو، انگریزی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

[2] سیرۃ المہدی حصّۂ اوّل صفحہ ۱۵۹

ساتھ ایک ہی شخص کی شخصیت میں خوشش جنگیگی اور انفعال کا بھی چھپا ہوا مادہ ہوتا
ہے۔ وہ بعض اداروں، قانونوں اور شخصیتوں کے خلاف بڑے جوش و خروش کے
ساتھ علم بغاوت بلند کرتا ہے اور آخر دم تک ان سے برسرِ جنگ رہتا ہے
لیکن کسی شخصیت و دعوت کے سامنے وہ بالکل سرافگندہ و سپر انداختہ نظر آتا
ہے اور اپنے قوائے فکر کو بالکل معطل کر دیتا ہے۔ انسان کی زندگی عمل و ردِ عمل
کا ایک عجیب مجموعہ اور اس کی شخصیت مختلف عناصر کا ایک ایسا مرکب
نظر آتی ہے کہ انسان ایک منفرد شخصیت نہیں بلکہ مختلف شخصیتوں کا ایک مجموعہ ثابت ہوتا
ہے۔ دنیا کی کسی چیز کا سمجھنا انسان کی شخصیت اور اس کے مقاصد و محرکات
کے سمجھنے سے زیادہ مشکل نہیں۔

باب دوم

مرزا غلام احمد صاحب کے عقیدہ اور دعوت کا تدریجی ارتقاء

اور

دعاوی کی ترتیب

فصلِ اوّل

مرزا صاحب مُصنّف و مُبلغِ اسلام کی حیثیت سے

تصنیف و مناظرہ کے میدان میں مرزا غلام احمد صاحب کے متعلق اس وقت تک ہماری معلومات یہ تھیں کہ وہ ضلع گورداسپور کے ایک قصبہ میں مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں منہمک ہیں۔ اُن کی جو تصنیفات ۱۸۸۰ء کے بعد شائع ہوئی ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے مطالعہ کا موضوع زیادہ تر کتبِ مذاہب اور خاص طور پر مسیحیت سناتن دھرم اور آریہ سماج کی کتابیں ہیں۔

یہ دور مذہبی مناظروں کا دور تھا اور اہلِ علم کے طبقہ میں سب سے بڑا ذوق، مقابلۂ مذاہب اور مناظرۂ فرق کا پایا جاتا تھا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عیسائی پادری مذہبِ مسیحیت کی تبلیغ و دعوت اور دینِ اسلام کی تردید میں سرگرم تھے۔ حکومتِ وقت جس کا سرکاری مذہب مسیحیت تھا، اُن کی پُشت پناہ اور سرپرست تھی۔ وہ ہندوستان کو یسوع مسیحؑ کا عطیہ اور انعام سمجھتی تھی۔ دُوسری طرف آریہ سماجی مبلغ جوش و خروش سے اسلام کی تردید کر

رہے تھے۔ انگریزوں کی مصلحت (جو ۱۸۵۷ء کی متحدہ کوشش اور ہندوستان کے اتحاد کی چوٹ کھا چکے تھے) یہ تھی کہ ان مناظرانہ سرگرمیوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ اس لیے کہ ان کے نتیجہ میں ملک میں ایک کشمکش اور ذہنی و اخلاقی انتشار پیدا ہوتا تھا اور تمام مذاہب اور فرقوں کو ایک ایسی طاقتور حکومت کا وجود غنیمت معلوم ہوتا تھا جو ان سب کی حفاظت کرے اور جس کے سایہ میں یہ سب امن و امان کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کرتے رہیں۔ ایسے ماحول میں جو شخص اسلام کی مدافعت اور مذاہب غیر کی تردید کا علم بلند کرتا وہ مسلمانوں کا مرکز توجہ و عقیدت بن جاتا۔

مرزا صاحب کی حوصلہ مند طبیعت اور دور بین نگاہ نے اس میدان کو اپنی سرگرمیوں کے لیے انتخاب کیا۔ انھوں نے ایک بہت بڑی ضخیم کتاب کی تصنیف کا بیڑہ اٹھایا، جس میں اسلام کی صداقت، قرآن کے اعجاز اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بدلائل عقلی ثابت کیا جائے گا اور بیک وقت مسیحیت، سناتن دھرم، آریہ سماج اور برہمو سماج کی تردید ہوگی، انھوں نے اس کتاب کا نام براہین احمدیہ تجویز کیا۔

براہین احمدیہ اور مرزا صاحب کا چیلنج

براہین احمدیہ کی تصنیف ۱۸۷۹ء سے شروع ہوتی ہے[1]۔ مصنف نے ذمہ داری لی کہ وہ اس کتاب میں صداقت اسلام کی تین سو دلیلیں پیش کریں گے۔ مرزا صاحب

[1] سیرۃ المہدی جلد ۲، صفحہ ۱۵۱

نے ملک کے دوسرے اہلِ علم اور اہلِ نظر حضرات اور مصنفین سے بھی کتاب کے موضوع کے سلسلہ میں خط و کتابت کی اور اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنے خیالات اور مضامین بھیجیں جن سے اس کتاب کی تصنیف میں مدد لی جاسکے، جن لوگوں نے اُن کی اس دعوت کو قبول کیا۔ ان میں مولوی چراغ علی صاحب بھی تھے جو سرسید کی بزمِ علمی کے ایک اہم رکن تھے۔ مرزا صاحب نے اُن کے مضامین و تحقیقات کو بھی کتاب میں شامل کیا۔[1]

بالآخر یہ کتاب جس کا سیکڑوں آدمیوں کو انتظار و اشتیاق تھا۔ چار حصوں میں (بڑے سائز کے پانچ سو باسٹھ صفحات) میں چھپ کر نکلی۔ مصنف نے اس کتاب کے ساتھ ایک اعلان بڑی تعداد میں اردو اور انگریزی میں شائع کیا اور اُس کو سلاطین، وزراء، پادری صاحبان اور پنڈتوں کے پاس بھیجا۔ جس میں انھوں نے پہلی مرتبہ اس کا اظہار کیا کہ وہ اسلام کی صداقت ظاہر کرنے کے لیے خدا کی طرف سے مامور ہیں اور وہ تمام اہلِ مذاہب کو مطمئن کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس اشتہار میں صاف صاف کہا گیا ہے:

"یہ عاجز (مؤلف براہین احمدیہ) حضرتِ قادرِ مطلق جل شانہٗ کی طرف سے مامور ہوا ہے کہ نبی ناصری اسرائیلی (مسیح) کے طرز پر

---

[1] لیکن اس کا کہیں کتاب میں حوالہ نہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے اپنی کتاب "چند ہم عصر" صفحہ [illegible] میں، اور ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنے ایک مضمون میں اس کا تذکرہ کیا ہے (حرفِ اقبال صفحہ ۱۳۹)

کمال مسکینی و فروتنی و غربت و تذلل و تواضع سے اصلاحِ خلق کے
لیے کوشش کرے اور ان لوگوں کو جو راہِ راست سے بے خبر ہیں،
صراطِ مستقیم (جس پر چلنے سے حقیقی نجات حاصل ہوتی ہے اور اسی عالم
میں بہشتی زندگی کے آثار اور قبولیت اور محبوبیت کے انوار دکھائی
دیتے ہیں) دکھاوے۔ اسی غرض سے کتاب براہینِ احمدیہ تالیف
پائی ہے جس کی ۳۷ جزو چھپ کر شائع ہو چکی ہیں اور اس کا خلاصہ
مطلب اشتہار ہمراہی خط ہذا میں مندرج ہے، لیکن چونکہ ساری کتاب
کا شائع ہونا ایک طویل مدت پر موقوف ہے، اسی لیے یہ قرار پایا
ہے کہ بالفعل یہ خلاصہ اشتہار انگریزی شائع کیا جائے اور اس کی ایک
ایک کاپی بخدمت معزز پادری صاحبان پنجاب و ہندوستان و انگلستان
وغیرہ بلاد جہاں تک ارسال خط ممکن ہو جو اپنی قوم میں خاص طور پر
مشہور اور معزز برہمو صاحبان و آریہ صاحبان و نیچری صاحبان و حضرات
مولوی صاحبان جو وجودِ خوارق و کرامات سے منکر ہیں اور اس وجہ
سے اس عاجز سے بدظن ہیں، ارسال کی جاوے۔[1]

انھوں نے چیلنج کیا کہ اس کتاب کی کوئی نظیر پیش کی جائے اور کسی
مذہب کے نمائندے اپنے دین کی صداقت کے لیے اسی تعداد میں یا اس

---

[1] مرزا غلام احمد صاحب کے مختصر حالات مرتبہ سراج الدین عمر صاحب قادیانی شامل حصہ اول براہین احمدیہ
صفحہ ۸۲۔

سے کم تعداد میں دلائل پیش کریں۔ وہ براہین احمدیہ کے شروع میں لکھتے ہیں:

"میں جو مصنف اس کتاب براہین احمدیہ کا ہوں یہ اشتہار اپنی طرف سے بہ وعدہ انعام دس ہزار روپیہ بمقابلہ جمیع ارباب مذہب اور ملت کے جو حقانیت قرآن مجید و نبوت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے منکر ہیں اتماماً للحجت شائع کر کے اقرار صحیح قانونی اور عہد جائز شرعی کرتا ہوں کہ اگر کوئی صاحب منکرین میں سے مشارکت اپنی کتاب کی فرقانِ مجید سے ان سب براہین اور دلائل میں جو ہم نے دربارہ حقیت فرقانِ مجید اور صدقِ رسالت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اسی کتاب مقدس سے اخذ کر کے تحریر کی ہیں۔ اپنی الہامی کتاب میں سے ثابت کر کے دکھلاویں یا اگر تعداد میں اُن کے برابر پیش نہ کر سکیں تو نصف اُن سے یا ثلث اُن سے یا ربع اُن سے، یا خمس اُن سے نکال کر پیش کرے یا اگر بکلی پیش کرنے سے عاجز ہو تو ہمارے ہی دلائل کو نمبر وار توڑ دے تو ان سب صورتوں میں بشرطیکہ تین منصف مقبولہ فریقین بالاتفاق یہ رائے ظاہر کر دیں کہ ایفاء شرط جیسا کہ چاہیئے تھا ظہور میں آگیا میں مشتہر ایسے مجیب کو بلا عذرے وحیلتے اپنی جائداد قیمتی دس ہزار روپیہ پر قبض و دخل دے دونگا۔"[1]

---

[1] براہین احمدیہ جلد اوّل صفحہ ۱۷ تا ۲۲

مرزا صاحب نے مسلمانوں کو اس عظیم خدمتِ اسلام میں مالی امداد دینے اور فراخ دلی اور عالی حوصلگی سے حصہ لینے کی دعوت دی۔[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی اس دعوت پر مسلمانوں نے اس جوش و خروش سے لبیک نہیں کہی جس کی مرزا صاحب توقع کرتے تھے۔ براہینِ احمدیہ کی بعد کی جلدوں میں اُنھوں نے اس کا بڑا شکوہ کیا ہے اور اس پر اپنے بڑے رنج کا اظہار کیا ہے۔[2]

ان اشتہارات میں جو کتاب کا دیباچہ اور مرزا صاحب کی آئندہ زندگی اور عزائم کی تمہید تھی ایک مُدعیانہ رُوح، نیز لوگوں کو مطلق کرنے اور حق کو ثابت کرنے کے لیے آسمانی نشانیوں پر اعتماد نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان اشتہارات میں کسی قدر تجارتی اور کاروباری رُوح بھی جھلکتی ہے۔

تبلیغ و سیاست

مرزا صاحب نے براہینِ احمدیہ کے تیسرے اور چوتھے حصہ کے شروع میں "اسلامی انجمنوں کی خدمت میں التماس ضروری اور مسلمانوں کی نازک حالت اور انگریزی گورنمنٹ"[3] کے عنوان سے انگریزی حکومت کی کھُل کر مدح و توصیف کی اور اس کے مسلمانوں پر احسانات گنائے ہیں اور اس بات کی پُرزور اپیل کی ہے کہ تمام اسلامی انجمنیں مل کر ایک میموریل تیار کر کے اور اس پر تمام سربرآوردہ مسلمانوں کے دستخط کرا کر گورنمنٹ میں بھیجیں۔ اس میں اپنی خاندانی خدمات کا پھر تذکرہ ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ

---

[1] ملاحظہ ہو براہینِ احمدیہ، التماس ضروری از مؤلف کتاب (الف) [2] ملاحظہ ہو حصہ سوم "عرض ضروری بحالتِ مجبوری"۔

جہاد کی ممانعت کی بھی پُر زور تحریک ہے؎[1]

اس طرح مرزا صاحب کی پہلی تصنیف بھی انگریزی حکومت کی منقبت و ثنا اور مسلمانوں کو سیاسی مشورہ دینے سے خالی نظر نہیں آتی۔

کتاب کا انجام

اس کتاب کی تالیف واشاعت کا سلسلہ ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک جاری رہا، چوتھے حصّہ پر یہ سلسلہ رُک گیا۔ پانچواں حصّہ جو کتاب کا آخری حصّہ ہے۔ آغاز تصنیف کے پورے پچیس سال بعد ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔؎[2] مصنّف نے حصّہ پنجم میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ ۲۳ برس تک اس کتاب کا چھپنا ملتوی رہا۔؎[3] اس دَوران میں بہت سے لوگ جنھوں نے کتاب کے چار حصّے خریدے تھے اور پُوری کتاب کی قیمت داخل کر چکے تھے۔ انتقال کر گئے۔ بعض لوگوں نے جو پیشگی قیمت ادا کر چکے تھے۔ اس پر ناگواری و ناراضی کا اظہار بھی کیا جس کے لیے مصنّف نے حصّہ پنجم کے مقدمہ میں معذرت بھی کی ہے۔ اس میں انھوں نے اس کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ پہلے اس کا خیال تھا کہ وُہ اسلام کی صداقت پر تین سَو دلیلیں پیش کریں گے، لیکن اب انھوں نے اس خیال کو ترک کر دیا ہے۔ اسی طرح سے پہلے پچاس حصّوں میں شائع کرنے کا قصد تھا لیکن اب پانچ حصّوں پر اکتفا کریں گے۔ اس لیے

؎[1] ملاحظہ ہو براہین احمدیہ، جلد سوم (ب)
؎[2] سیرۃ المہدی جلد ۲، صفحہ ۱۵۴
؎[3] دیباچہ حصّہ پنجم، براہین احمدیہ صفحہ ۱

کہ ان دونوں عددوں میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"پہلے پچاس حصے لکھنے کا ارادہ تھا مگر پچاس سے پانچ پر اکتفا کیا گیا اور چونکہ پچاس اور پانچ کے عدد میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے۔ اس لیے پانچ حصوں سے وہ وعدہ پورا ہو گیا۔"[1]

مرزا بشیر احمد صاحب نے سیرۃ المہدی میں لکھا ہے: "اب جب براہین احمدیہ کی چار جلدیں شائع شدہ موجود ہیں، ان کا مقدمہ اور حواشی وغیرہ سب دورانِ اشاعت کے زمانہ کے ہیں اور اس میں اصل ابتدائی تصنیف کا حصہ بہت ہی تھوڑا آیا ہے، یعنی صرف چند صفحات سے زیادہ نہیں، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تین سو دلائل جو آپ نے لکھے تھے، اس میں سے مطبوعہ براہین احمدیہ میں صرف ایک ہی دلیل بیان ہوتی ہے۔ اور وہ بھی نامکمل طور پر"[2]

کتاب پر ایک اجمالی نظر

جو شخص براہینِ احمدیہ کا مطالعہ کرے گا وہ مصنف کی بسیار نویسی، دراز نفسی اور صبر و جفاکشی سے ضرور متاثر ہوگا۔ یہ تمام صفات ایسی ہیں جو مصنف کو عیسائیوں اور آریہ ماجیوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب مناظر اور ایک بڑا مصنف ثابت کرتی ہیں، لیکن کتاب کے پڑھنے والے کو اس ضخیم دفتر میں کوئی نادر

---

[1] دیباچہ براہین احمدیہ، ج ۵، صفحہ ۷ [2] سیرۃ المہدی جلد ۱، صفحہ ۱۱۲

علمی تحقیق اور مسیحیت کے ماخذ اور اس کی قدیم کتابوں اور اس کے اسرار و حقائق سے اس طرح کی واقفیت نہیں نظر آتی جو مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی (م ۱۳۰۸ھ) مصنف اظہار الحق و ازالۃ الاوہام وغیرہ کی تصنیفات میں نظر آتی ہے۔ نہ وہ شیریں گفتاری اور ندرت استدلال نظر آتی ہے جو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) مصنف تقریر دل پذیر و حجۃ الاسلام وغیرہ کی خصوصیت ہے۔

الہامات و دعاوی

پڑھنے والے کو اس کتاب میں اس کثرت سے الہامات اور خوارق، کشف، مکالمات خداوندی، پیش گوئیاں اور طویل و عریض دعوے ملتے ہیں جن سے اس کی طبیعت بدمزہ و منغض ہو جاتی ہے اور کتاب ایک پاکیزہ علمی بحث اور ایک مہذب دینی مباحثہ کے بجائے ایک مدحیانہ تصنیف بن جاتی ہے جس میں مصنف نے اپنی شخصیت کا صاف صاف اشتہار دیا ہے اور جگہ جگہ اس کا ڈھنڈورا پیٹا ہے۔

کتاب کا مرکزی مضمون اور جوہر یہ ہے کہ الہام کا سلسلہ منقطع ہوا ہے نہ اس کو منقطع ہونا چاہیے۔ یہی الہام دعوے کی صحت اور مذہب و عقیدے کی صداقت کی سب سے زیادہ طاقتور دلیل ہے۔ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کامل کرے گا، اس کو علم ظاہر اور علم باطن سے سرفراز کیا جائے گا جو انبیاء علیہم السلام کو اصالتاً عطا ہوا تھا اور اس کو علم یقینی اور علم قطعی حاصل ہوگا،

اس کا علم لدنی انبیاءؑ کے علم سے مشابہ ہوگا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو حدیث میں اُمثل کے لفظ سے اور قرآنِ مجید میں صدّیق کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ ان کے ظہور کا زمانہ انبیاءؑ کی بعثت کے زمانہ سے مشابہ ہوگا اور انھیں سے اسلام کی محبت قائم ہوگی اور اُن کا الہام یقینی و قطعی الہام ہوگا۔[۱] اس الہام کے بقاء و تسلسل کے ثبوت میں انھوں نے بطورِ نمونہ اپنے طویل الہامات کا ایک سلسلہ نقل کیا ہے۔ وہ براہین احمدیہ میں لکھتے ہیں :

"اس الہام کی مثالیں ہمارے پاس بہت ہیں مگر وہ جو ابھی اس حاشیہ کے تحریر کے وقت یعنی مارچ ۱۸۸۲ء میں ہوا ہے جس میں یہ امرِ غیبی بطورِ پیشگوئی ظاہر کیا گیا ہے کہ اس اشتہاری کتاب کے ذریعہ سے اور اس کے مضامین پر مطلع ہونے سے انجام کار مخالفین کو شکست فاش آئے گی اور حق کے طالبوں کو ہدایت ملے گی اور بدعقیدگی دور ہوگی اور لوگ خدائے تعالیٰ کے القا اور رجوع دلانے سے مدد کریں گے اور متوجہ ہوں گے اور آئیں گے وغیرہا بن الامور"[۲]

اس کے بعد مرزا صاحب نے وہ طویل تازہ الہام نقل کیا جو تقریباً تمام تر قرآن مجید کی مختلف آیتوں کے غیر مربوط ٹکڑوں کا مجموعہ ہے یہ الہام براہین کی تقریباً چالیس سطروں میں آیا ہے اور اُن چالیس سطروں میں تقریباً ۵۴'

---

[۱] براہین احمدیہ جلد ۳، صفحہ ۲۳۱ و صفحہ ۲۴۲ باختصار
[۲] براہین احمدیہ جلد ۳ صفحہ ۲۳۹

۴۵ آیتوں کے ٹکڑے ہیں۔ بیچ بیچ میں چند حدیثیں بھی ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ جو مرزا صاحب کے گھڑے ہیں، وہ ہندوستانی عربی کا ایک نمونہ ہیں۔ نمونہ کے طور پر اس کی آخری سطریں جس میں نسبتہً آیات کم ہیں، درج کی جاتی ہیں:

"کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل، وکن

من الصالحین الصدیقین وامر بالمعروف وانہ عن المنکر

وصل علی محمد و آل محمد۔ الصلوٰۃ ہو المربی انی رافعک

الیّ و القیت علیک محبۃ منی: لا الٰہ الا اللہ فاکتب

ولیطبع ولیرسل فی الارض۔ خذوا التوحید التوحید یا

ابناء الفارس؟ وبشر الذین آمنوا ان لہم قدم صدق

عند ربہم، واتل علیہم ما اوحی الیک من ربک۔ ولا

تصعر لخلق اللہ ولا تسئم من الناس۔ اصحاب الصفۃ

وما ادرٰک ما اصحاب الصفۃ۔ تریٰ اعینہم تفیض

من الدمع۔ یصلون علیک۔ ربنا اننا سمعنا منادیا

ینادی للایمان وداعیا الی اللہ وسراجا منیرا، املوا[1]

---

[1] براہین احمدیہ جلد سوم صفحہ ۲۴۲ • ترجمہ: دُنیا میں ایسے رہو جیسے پردیسی یا مسافر رہتا ہے اور نیکیوں اور صدیقوں میں شامل ہو اور نیکی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو اور حضرت محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر درود بھیجو درود وہ صلوٰۃ ہی پرورش کرنے والی ہے۔ بیشک میں تجھ کو اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور میں نے تیری محبت لوگوں کے دل میں پیدا کر دی ہے۔ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس لکھو اور چھپنا چاہیے اور ملک میں بھیجنا

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

اسی طرح سے جلد چہارم میں ایک الہام نقل کیا گیا ہے۔ وہ بھی اسی طرح سے قرآن مجید کی آیتوں اور الفاظ قرآنی کا ایک غیر مربوط مجموعہ ہے۔ اس میں عربیت اور قواعد کی بھی فاش غلطیاں ہیں[1]۔ چونکہ مرزا صاحب نے اس کا ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ اس لیے متن و ترجمہ دونوں نقل کیے جاتے ہیں:

و اذا قیل لہم اٰمنوا کما اٰمن الناس	اور جب اُن کو کہا جائے کہ ایمان لاؤ جیسے
قالوا انؤمن کما آمن السفہاء الا انہم ہم	لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کیا ہم ایسا ہی
السفہاء ولکن لا یعلمون، ویحبّون	ایمان لاویں جیسے بیوقوف ایمان لائے ہیں خبردار ہو
ان یدھنون (؟) ، قل یا ایہا الکافرون	وہی بیوقوف ہیں مگر جانتے نہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ تم اُن سے
لا اعبد ما تعبدون ، قیل ارجعوا	مداہنہ کرو کہہ کہ اے کافرو میں اس چیز کی پرستش نہیں کرتا
الی اللہ فلا ترجعون و قیل استحوذوا	جس کی تم کرتے ہو تم کو کہا گیا کہ خدا کی طرف رجوع کرو
فلا تستحوذون ، ام تسئلہم من خرج	تم رجوع نہیں کرتے اور تم کو کہا گیا جو تم اپنے نفسوں پر غالب
فہم من مغرم مثقلون بل اٰتیناہم بالحق	آجاؤ سو تم غالب نہیں آتے کیا تو ان لوگوں سے کچھ خراج

(بقیہ صفحہ ۵۵)

چاہیے۔ توحید اختیار کرو ، توحید اختیار کرو۔ اے ایمان والو! اور بشارت دو اُن لوگوں کو جو ایمان لائے کہ ان کا اُن کے رب کے یہاں بڑا پایہ ہے اور ان کو پڑھ کر سناؤ جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے وحی کی گئی ہے اور خلق خدا کے لیے منہ نہ پھلاؤ اور لوگوں سے نہ اکتاؤ، چھوٹے والے اوتھیں کیا خبر کیا ہیں جو تیرے والے تم دیکھتے ہو ان کی آنکھوں کو آنسوؤں سے تر ہیں۔ تم پر درود بھیجتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم نے ایک پکارنے والے کو پکارتے ہوئے سنا کہ ایمان کی صدا لگاتا ہے۔ اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ، اُمید رکھو

[1] ان غلطیوں پر ہم نے علامت استفہام بنا دی ہے

فهم للحق كارهون، سبحانه و تعالى عمّا يصفون، احسب الناس ان يتركوا ان يقولوا امنّا و هم لا يفتنون، يحبّون ان يحمدوا بما لم يفعلوا و لا يخفى على الله خافية و لا يصلحه شي قبل اصلاحه و من ردّ من مطبعه (؟) فلا مردّ له ۔

مانگتا ہے، پس وہ اس تاوان کی وجہ سے حق کو قبول کرنا ایک پہاڑ سمجھتے ہیں، بلکہ ان کو سنت حق کا جاتا ہے اسلئے وہ حق سے کراہت کرتے ہیں، خدا تعالیٰ ان عیبوں سے پاک و برتر ہے جو وہ لوگ اس کی ذات پر لگاتے ہیں، کیا یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بے امتحان کیے صرف زبانی ایمان کے دعوے سے چھوٹ جاویں گے، چاہتے ہیں جو ایسے کاموں سے تعریف کی جاتے جن کو انھوں نے کیا نہیں اور خدائے تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی نہیں اور جب تک وہ کسی چیز کی اصلاح نہ کرے اصلاح نہیں ہو سکتی اور جو شخص اس کے مطبع سے رد کیا جائے اس کو کوئی واپس نہیں لا سکتا[1]

عربی کے علاوہ اس کتاب میں دو انگریزی کے الہام بھی درج ہیں۔[2]

براہین احمدیہ میں مرزا صاحب کا عقیدہ

براہین احمدیہ کے ان چار حصوں میں جو ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک شائع ہوئے ہیں۔ مرزا صاحب نے صرف اس عقیدہ کا اظہار کیا ہے کہ الہام کا سلسلہ برابر جاری ہے اور جاری رہے گا اور انبیاء کی وراثت علم لدنّی اور نور یقین اور علم قطعی کے باب میں جاری ہے۔ اس کتاب میں اپنی ذات کے متعلق وہ بار بار اظہار کرتے ہیں کہ وہ

---

[1] براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۰۹ طبع ریاض ہند مطبوعہ

[2] ملاحظہ ہو براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۵۶، ۵۵۷ ۔

دُنیا کی اصلاح اور اسلام کی دعوت کے لیے خدا کی طرف سے مامور اور مجدّدِ زمانہ[1] کے مجدّد ہیں اور اُن کو حضرت مسیحؑ سے مماثلت حاصل ہے۔ اس کتاب میں اُن کو حضرت مسیحؑ کے آسمان پر جانے اور دوبارہ اُترنے کا بھی اقرار ہے۔ خود مرزا صاحب نے نزول المسیح کے ضمیمہ میں جو ۱۹۰۲ء کی تالیف ہے اور براہین احمدیہ کے حصّہ پنجم میں جو ۱۹۰۵ء کی تصنیف ہے اس کا اعتراف اور اس امر پر اظہارِ تعجّب کیا ہے کہ وہ اس وقت تک عقیدۂ رفع و نزولِ مسیحؑ کے قائل تھے[2]۔

براہین احمدیہ میں مرزا صاحب بڑی شدومد سے کسی جدید نبوّت اور کسی جدید وحی کا انکار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن مجید اور اس کی تعلیمات کو کسی تحریف کا خطرہ نہیں ہے، اور نہ مسلمانوں کے دورِ بُت پرستی و مخلوق پرستی کی طرف واپس جانے کا کوئی اندیشہ ہے بلکہ اس کے برعکس مشرکین کی طبیعتیں بباعث متواتر استماعِ تعلیم فرقانی اور دائمی صحبتِ اہلِ توحید کچھ کچھ توحید کی طرف میل کرتی جاتی ہیں اور نبوّت و وحی کا کام انھیں دونوں خطرات کا سدِّباب کرنا اور انھیں دونوں خرابیوں کی اصلاح ہے۔ اس لیے اب کسی جدید شریعت اور کسی نئے الہام کی ضرورت نہیں؛ اور یہ ثابت ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم رُسل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اور جبکہ قرآن مجید کے اصُول حقّہ کا محرّف و مبدّل ہو جانا یا

---

[1] ملاحظہ ہو سیرۃ المہدی جلد ۱، صفحہ ۳۹ [2] ضمیمہ کتاب نزول المسیح صفحہ ۶ و براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۵۵۔

پھر ساتھ اس کے تمام خلقت پر تاریکیِ شرک اور مخلوق پرستی کا بھی پھیلا جانا جنوں العقل محال و ممتنع ہوا تو نئی شریعت و نئے الہام کے نازل ہونے میں بھی امتناع عقلی لازم آیا کیونکہ جو امر مستلزم محال ہو، وہ بھی محال ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ آنحضرتؐ حقیقت میں خاتم رُسل ہیں[1]

کتاب کا اثر اور اس کا ردِ عمل

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے علمی و دینی حلقوں میں اس کتاب کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب بہت صحیح وقت پر شائع ہوئی تھی۔ مرزا صاحب اور ان کے دوستوں نے اس کی تشہیر و تبلیغ بھی بہت جوش و خروش سے کی تھی۔ اس کتاب کی کامیابی اور اس کی تاثیر کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس میں دوسرے مذاہب کو چیلنج کیا گیا تھا اور کتاب جواب دہی کے بجائے حملہ آورانہ انداز میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے خاص معترفین اور پُرجوش تائید کرنے والوں میں مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے رسالہ اشاعت السنہ میں اس پر ایک طویل تبصرہ یا تقریظ لکھی۔ جو رسالہ کے چھ نمبروں[2] میں شائع ہوئی ہے اس میں کتاب کو بڑے شاندار الفاظ میں سراہا گیا ہے، اور اس کو عصرِ حاضر کا ایک علمی کارنامہ اور تصنیفی شاہکار قرار دیا گیا ہے۔ اس کے

---

[1] حاشیہ براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۱۸۲ [2] جلد ہفتم ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۶۹ ، ۱۷۰ ، ۱۹۰ ، ۱۰ ، ۱۱

کچھ عرصہ بعد ہی مولانا، مرزا صاحب کے دعاوی اور الہامات سے کھٹک گئے اور بالآخر وہ اُن کے بڑے حریف اور مدِ مقابل بن گئے۔

اس کے برخلاف بعض علماء کو اسی کتاب سے کھٹک پیدا ہوئی اور اُن کو یہ نظر آنے لگا کہ یہ شخص نبوت کا مدعی ہے یا عنقریب دعویٰ کرنے والا ہے۔ ان صاحب فراست لوگوں میں مولانا عبد القادر صاحب لدھیانوی مرحوم کے دونوں صاحبزادے مولانا محمد صاحب اور مولانا عبد العزیز صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امرتسر کے اہل حدیث علماء اور غزنوی حضرات میں سے بھی چند صاحبوں نے ان الہامات کی مخالفت کی اور اس کو مستبعد قرار دیا۔[1]

اس کتاب کی اشاعت نے مرزا صاحب کو دفعۃً قادیان کے گوشۂ گمنامی سے نکال کر شہرت و احترام کے منظرِ عام پر کھڑا کر دیا اور لوگوں کی نگاہیں اُن کی طرف اُٹھ گئیں۔ مرزا بشیر احمد صاحب نے سیرۃ المہدی میں صحیح لکھا ہے:

"براہین کی تصنیف سے پہلے حضرت مسیح موعود ایک گمنامی کی زندگی بسر کرتے تھے اور گوشہ نشینی میں درویشانہ حالت تھی۔ گو براہین سے قبل بعض اخباروں میں مضامین شائع کرنے کا سلسلہ آپ نے شروع فرما دیا تھا اور اس قسم کے اشتہارات سے آپ کا نام ایک گونہ پبلک میں بھی آگیا تھا مگر بہت کم ------------ دراصل

---

[1] رسالہ اشاعت السنۃ، جلد ہفتم۔ ۶۔ جون ۱۸۸۴ء

مستقل طور پر براہین احمدیہ کے اشتہار نے ہی سب سے پہلے آپ کو ملک کے سامنے کھڑا کیا اور اس طرح علم دوست اور مذہبی اُمور سے لگاؤ رکھنے والے طبقہ میں آپ کا انٹروڈکشن ہوا اور لوگوں کی نظریں اس دیہات کے رہنے والے گمنام شخص کی طرف حیرت کے ساتھ اٹھنی شروع ہوئیں جس نے اس تحدی اور اتنے بڑے انعام کے وعدے کے ساتھ اسلام کی حقانیت کے متعلق ایک عظیم الشان کتاب لکھنے کا اعلان کیا اب گویا آفتابِ ہدایت جو لاریب اس سے قبل طلوع کر چکا تھا، اُفق سے بلند ہونے لگا۔ اس کے بعد براہین احمدیہ کی اشاعت نے ملک کے مذہبی حلقہ میں ایک غیر معمولی تموّج پیدا کر دیا۔ مسلمانوں نے عام طور پر مصنف براہین کا ایک مجدد ذی شان کے طور پر خیر مقدم کیا اور مخالفین اسلام کے کیمپ میں بھی اس گولہ باری سے ایک ہل چل مچ گئی۔[1]

خود مرزا صاحب براہین احمدیہ کی تصنیف سے پہلے اپنی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ وہ زمانہ تھا جس میں مجھے کوئی بھی نہیں جانتا تھا، نہ کوئی موافق تھا، نہ مخالف، کیونکہ میں اس زمانہ میں کچھ بھی چیز نہ تھا اور ایک احد من الناس اور زاویۂ گمنامی میں پوشیدہ تھا۔"[2]

---

[1] سیرۃ المہدی حصہ اوّل صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳

[2] تتمہ حقیقت الوحی، صفحہ ۲۷، ۲۸

اس کے آگے لکھتے ہیں :

"اس قصبہ (قادیان) کے تمام لوگ اور دوسرے ہزارہا لوگ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں درحقیقت میں اس مُردہ کی طرح تھا جو قبر میں صدہا سال سے مدفون ہو اور کوئی نہ جانتا ہو کہ یہ کس کی قبر ہے"[1]

آریہ سماج سے مناظرہ

۱۸۸۶ء میں مرزا صاحب نے ہوشیار پور میں مُرلی دھر آریہ سماج سے مناظرہ کیا۔ اس مناظرہ کے بارے میں اُنھوں نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام "سرمۂ چشم آریہ" ہے۔ یہ کتاب مناظرۂ مذاہب و فِرَق میں اُن کی دوسری تصنیف ہے۔

پہلے دن کے مناظرہ کا موضوع بحث "معجزۂ شق القمر کا عقلی و نقلی ثبوت" تھا مرزا صاحب نے اپنی اس کتاب میں نہ صرف اس معجزہ بلکہ معجزاتِ انبیاءؑ کی پُرزور مُدلّل وکالت کی ہے۔ اُنھوں نے ثابت کیا ہے کہ معجزات و خوارق کا وقوع عقلاً ممکن ہے۔ محدود انسانی عقل اور علم اور محدود انفرادی تجربات کو اس کا حق نہیں کہ وہ ان معجزات و خوارق کا انکار کریں اور اس وسیع کائنات کے احاطہ کا دعویٰ کریں، وہ بار بار اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ انسان کا علم محدود و مختصر اور امکان کا دائرہ بہت وسیع ہے[2] ان کا اس پر بھی زور ہے کہ مذاہب و عقائد کے لیے ایمان بالغیب ضروری ہے اور اس میں اور عقل میں کوئی منافات

---

[1] تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۸ [2] سرمۂ چشم آریہ، صفحہ ۵۵

نہیں اس لیے کہ عقل غیر محیط ہے، واقعہ یہ ہے کہ بعد میں اُنھوں نے رفع و نزولِ مسیحؑ کے بارے میں اور حضرت مسیحؑ کے صدیوں تک آسمان میں رہنے پر جو عقلی اشکال پیش کیے ہیں اور بعد میں اُن کے اندر جو عقلیت کا رجحان پایا جاتا ہے اُس کی تردید میں اس کتاب سے زیادہ موزوں کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ اس کتاب میں مصنف کی جو شخصیت نظر آتی ہے وہ بعد کی کتابوں کی شخصیت سے بہت مختلف ہے

رُخ کی تبدیلی

مرزا صاحب کو اپنی ان دو کتابوں کے لکھنے کے بعد اپنی شخصیت کا ایک نیا انکشاف ہوا۔ ان کو اپنی تحریری و مشکلانہ و مناظرانہ صلاحیتوں کا علم ہوا اور اُن کو اندازہ ہوا کہ ان میں اپنے ماحول کو متاثر کرنے اور ایک نئی تحریک و دعوت کے چلانے کی اچھی استعداد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس انکشاف نے اُن کے ذہن میں ایک نئی تبدیلی پیدا کی۔ اب اُن کا رُخ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے مناظرہ کرنے کے بجائے خود مسلمانوں کو دعوتِ مناظرہ و مقابلہ دینے کی طرف ہو گیا۔

فصل دوم

مسیح موعود کا دعویٰ

مرزا صاحب اور حکیم صاحب کے تعلقات

پچھلے صفحات سے ہم کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حکیم نور الدین صاحب بہ سلسلۂ ملازمت جموں میں مقیم تھے۔ اسی زمانہ میں مرزا صاحب سیالکوٹ میں حاکمِ ضلع کے یہاں ملازم تھے۔ دونوں میں خاص ذہنی مناسبت اور ذوقی اتحاد تھا دونوں مذہبی مناظرے و مباحثے کے شائق اور دونوں بلند حوصلہ طبیعت رکھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی شخصیت سے متاثر ہوا ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان ۱۸۸۵ء سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب کے مجموعۂ مکاتیب میں پہلا خط حکیم صاحب کے نام ۸ مارچ ۱۸۸۵ء کا ملتا ہے۔ یہ خط و کتابت برابر جاری رہتی ہے اور دونوں خانگی و ازدواجی امور تک میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں۔ مرزا صاحب حکیم صاحب کی ملاقات کے لیے جنوری ۱۸۸۸ء میں کشمیر کا سفر اختیار کرتے ہیں اور ایک ہفتہ حکیم صاحب کے پاس قیام کرتے ہیں۔ مرزا صاحب برابر حکیم صاحب

کرامات، مبشرات اور نادر علوم و تحقیقات سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔ وہ حکیم صاحب سے علماء کی مخالفت و تکفیر کی بھی شکایت کرتے ہیں۔ ۱۵ جولائی ۱۸۹۰ء کے ایک خط میں وہ حکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہیں: "اور میں نے سُنا ہے اِن لوگوں نے کچھ دبی زبان سے کافر کہنا شروع کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ ایک بڑے امر کو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔"[1]

۱۸۹۰ء تک مرزا صاحب کا دعویٰ

مرزا صاحب نے اس وقت تک صرف مجدد و مامور ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور مصنف سیرۃ المہدی (مرزا بشیر احمد صاحب) کے بقول صرف یہ فرماتے رہے کہ "مجھے اصلاحِ خلق کے لیے مسیح ناصری کے رنگ میں قائم کیا گیا ہے اور مجھے مسیح سے مماثلت ہے۔"[2] انھوں نے براہین احمدیہ میں اس خیال کو ظاہر کیا تھا کہ دینِ اسلام کا غلبۂ کامل جس کا وعدہ هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین کله میں کیا گیا ہے مسیح موعود کے ذریعہ ظہور میں آئے گا جن کی دُنیا میں دوبارہ آمد کی احادیث میں خبر دی گئی ہے۔ وہ صرف حضرت مسیحؑ کی اس پہلی زندگی کا نمونہ ہیں جب وہ اس دُنیا میں تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "یہ آیت (هو الذی ارسل رسوله) جسمانی اور سیاستِ مُلکی کے طور پر حضرت مسیح کے حق میں پیشگوئی ہے اور جس غلبۂ کاملۂ دینِ

---

[1] مکتوبات احمدیہ، جلد پنجم صفحہ ۹۰
[2] سیرۃ المہدی، حصّہ اوّل، صفحہ ۳۹

اسلام کا وعدہ دیا گیا ہے۔ وہ غلبہ مسیح کے ذریعے ظہور میں آئے گا اور جب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو اُن کے ہاتھ سے دینِ اسلام جمیع آفاق اور اقطار میں پھیل جائے گا لیکن اس عاجز پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ خاکسار اپنی غربت اور انکسار اور توکّل اور ایثار اور آیات اور انوار کی رُو سے مسیح کی پہلی زندگی کا نمونہ ہے اور اس عاجز کی فطرت اور مسیح کی فطرت باہم نہایت ہی متشابہ واقع ہوئی ہے گویا ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے یا ایک ہی درخت کے دو پھل ہیں اور بحدے اتحاد ہے کہ نظرِ کشفی میں نہایت ہی باریک امتیاز ہے۔[1]

ایک اہم مشورہ

۱۸۹۱ء عیسوی تقویم کا وہ سال ہے جو مرزا صاحب کی زندگی اور قادیانیت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اسی سال کے آغاز میں حکیم صاحب نے ایک خط میں مرزا صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ مسیح موعود[2] ہونے کا دعویٰ کریں۔ ہم کو حکیم صاحب کا اصل خط تو نہیں مل سکا، لیکن مرزا صاحب نے اس خط کا جو جواب دیا ہے اس میں حکیم صاحب کے

---

[1] براہین احمدیہ، حصہ چہارم صفحہ ۴۹۵—۴۹۸۔

[2] حکیم صاحب نے اپنے خط میں اگرچہ مثیلِ مسیح کے الفاظ لکھے ہیں لیکن جیسا کہ فتح اسلام اور ازالہ اوہام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے مثیلِ مسیح اور مسیح موعود دونوں مترادف ہیں اور مرزا صاحب ان دونوں کو اپنی کتابوں میں ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ خود توضیح مرام کے صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں "اس نزول سے مراد درحقیقت مسیح ابن مریم کا نزول نہیں بلکہ استعارہ کے طور پر ایک مثیلِ مسیح کے آنے کی خبر دی گئی ہے جس کا مصداق حسبِ اعلام و الہام الٰہی یہی عاجز ہے۔"

اس مشورہ کا حوالہ ہے۔ یہ خط اُن کے مجموعۂ مکاتیب میں موجود ہے اور اس پر ۲۴ جنوری ۱۸۹۱ء کی تاریخ درج ہے۔ اس سے اس تحریک کے فکری سرچشمہ کا اور اس کے اصل مجوّز و مصنّف کا علم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کے اس تاریخی خط کا اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"جو کچھ آں مخدوم نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر دمشقی حدیث کے مصداق کو علیحدہ چھوڑ کر الگ مثیل مسیح کا دعویٰ ظاہر کیا جائے تو اس میں حرج کیا ہے؟ درحقیقت اس عاجز کو مثیل مسیح بننے کی کچھ حاجت نہیں، یہ بننا چاہتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے عاجز اور مطیع بندوں میں داخل کر لیوے۔ لیکن ہم ابتلاء سے کسی طرح بھاگ نہیں سکتے۔ خدا تعالیٰ نے ترقیات کا ذریعہ صرف ابتلاہی کو رکھا ہے، جیسا کہ وہ فرماتا ہے "احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لا یفتنون[1]"۔

اس مشورہ کے حقیقی اسباب و محرکات کیا تھے؟ کیا یہ حکیم صاحب کی دُوربینی اور دُور اندیشی اور حوصلہ مند طبیعت ہی کا نتیجہ تھا یا یہ حکومتِ وقت کے اشارہ سے تھا جس کو ماضی قریب میں حضرت سیّد احمد صاحبؒ کی دینی و رُوحانی شخصیت اور اُن کی تحریک و دعوت سے بڑا نقصان پہنچ چکا تھا اور اسی دَور میں مہدی سُوڈانی کے دعوے مہدویت سے سُوڈان میں

---

[1] مکتوبات احمدیہ، جلد پنجم نمبر ۲، صفحہ ۸۵۔

ایک زبردست شورش اور بغاوت پیدا ہو چکی تھی۔ اس سب کے توڑ اور آئندہ کے خطرات کے سدِباب کے لیے یہی صورت مناسب تھی کہ کوئی قابلِ اعتماد شخصیت جس نے مسلمانوں میں اپنی دینی خدمات اور جوشِ مذہبی سے اثر و رسوخ پیدا کر لیا ہو۔ مسیح موعود کے دعوے اور اعلان کے ساتھ کھڑی ہو اور وہ مسلمان جو ایک عرصہ سے مسیح موعود کے منتظر ہیں، اس کے گرد جمع ہو جائیں؟ ہم وثوق کے ساتھ اُن میں سے کسی ایک چیز کی تعیین نہیں کر سکتے اور نہ اسباب و محرکات کا پتہ لگانا آسان ہے۔ لیکن اس خط سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس تحریک کا آغاز کس طرح ہوتا ہے

انبیاء کا اعلانِ نبوت کسی تحریک و مشورہ سے نہیں ہوتا

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انبیاء و مرسلین کا معاملہ ان خارجی تحریکات و مشوروں اور رہنمائیوں سے بالکل الگ ہے۔ اُن پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے اور اُن کو اُن کے منصب و مقام کی قطعی اور واضح طریقہ پر خبر دی جاتی ہے۔ وہ اس یقین سے سرشار ہوتے ہیں اور پہلے دن سے اس کا اعلان اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔ اُن کے عقیدہ اور دعوت کا سلسلہ کسی تجویز یا رہنمائی کا رہینِ منت نہیں ہوتا۔ ان کا پہلے دن سے یہ کہنا ہوتا ہے:

وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ مجھے اسی کا حکم ہوا ہے اور میں پہلا فرمانبردار ہوں

و بذٰلک امرت و انا اول المؤمنین مجھے اسی کا حکم ہے اور میں اس پر پہلا یقین کرنے والا ہوں

نزولِ مسیح کا عقیدہ

نزولِ مسیحؑ کا عقیدہ ایک اسلامی عقیدہ ہے[1]۔ مسلمان اس عقیدہ سے واقف اور اس کے قائل تھے۔ احادیث میں اس کی اطلاع دی گئی ہے اور مسلمان حالات کی خرابی اور پیہم حوادث و مصائب کے اثر سے کسی مردِ غیب کے منتظر بھی تھے اور بالخصوص تیرھویں صدی کے خاتمہ پر ظہورِ مسیح کا چرچا بھی تھا۔ حکیم صاحب کو اس کا خیال ہو سکتا تھا کہ مرزا صاحب نے اپنی دینی خدمات سے جو مقام حاصل کر لیا ہے، اس کی بنا پر مسلمان اُن کے اس دعوائے مسیحیت کو تسلیم کر لیں گے۔

---

[1] حضرت مسیحؑ کے آسمان پر جانے اور دوبارہ آنے کا عقیدہ مسلمانوں کے ان عقائد میں سے ہے جن پر قرآن بھی دلالت کرتا ہے اور جو متواتر احادیث و آثار سے ثابت ہیں اور جو مسلمانوں میں بلا کسی انقطاع کے تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی تصریح کی ہے کہ نزولِ مسیح کی احادیث درجۂ تواتر کو پہنچ چکی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ابو الحسین آبریؒ سے تواتر کا قول نقل کیا ہے۔ علامہ شوکانیؒ کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر التوضیح فی تواتر ما جاء فی المنتظر والدجال والمسیح کے نام سے ہے۔ جہاں تک نقل کا تعلق ہے کسی قابلِ اعتماد شخصیت سے اس کے خلاف منقول نہیں۔ معتزلہ کی طرف بھی اس کی نسبت صحیح نہیں۔ علامہ ابن حزمؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الفصل فی الملل والنحل میں صاف لکھ دیا ہے کہ عقیدۂ نزول تواتر سے ثابت ہے۔ اس نقل و تفصیلات کے لیے مولانا انور شاہ صاحبؒ کی جلیل القدر تصنیف عقیدۃ الاسلام دیکھی کی جائے۔ جہاں تک اس کے عقلی پہلو کا تعلق ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو محیط اور اللہ کی صفات افعال کو کامل ماننے کے بعد کسی ایسی چیز کے امکان و وقوع میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں جو نقلِ صحیح اور تواتر سے ثابت ہو خصوصیت کے ساتھ طبیعیات و علوم طبعیہ کی جدید ترقیات و تحقیقات کے بعد اور ان واقعات کے پے در پے وقوع کے بعد جو علم و حکمت نصف کی اس ترقی سے پہلے عقلی طور پر محال و ناممکن الوقوع سمجھے جاتے تھے اور ایسے زمانہ میں جب مصنوعی چاند قلیل سے قلیل وقت میں دنیا کے گرد چکر لگا لیتے ہیں اور انسان چاند تک پہنچ چکا اور خلا اور فضائے بسیط میں سفر کی کوشش کر رہا ہے۔ فاطرِ کائنات کے حکم و ارادہ سے کسی جسم کا زمین سے اوپر جانا اور طویل مدت تک رہنا کیا ناممکن اور مستبعد ہے۔ اس مسئلہ میں ان عقلی اشکالات کو پیش کرنا جو یونانی فلسفہ کی قدیم ہیئت کے خیالی مفروضات اور فرضی قیاسات پر مبنی ہیں ایک علمی مغالطہ و خفت ہے جس کی اس ترقی یافتہ زمانہ میں گنجائش نہیں۔

مرزا صاحب مثیلِ مسیح ہونے کے مدعی

مرزا صاحب نے جس انداز میں حکیم صاحب کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت کی ہے اور ان کے خط سے جس کسرِ نفسی، تواضع اور خشیت کا اظہار ہوتا ہے وہ بھی قابلِ قدر چیز ہے اور اس سے مرزا صاحب کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اُن کی کتابوں کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد یہ تاثر اور عقیدت جلد ختم ہو جاتی ہے اچانک یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے حکیم صاحب کی اس تجویز کو قبول کر لیا اور تھوڑے ہی دنوں میں اُنھوں نے مثیلِ مسیح ہونے کا دعویٰ اور اعلان کر دیا۔

اس سلسلۂ تصانیف کے بعد جس میں اسلام کی خالص حمایت اور مذاہبِ غیر کی تردید تھی اور جو مسیحِ موعود کے دعویٰ سے بالکل خالی ہیں[1]۔ مرزا صاحب کی پہلی تصنیف "فتح اسلام" ہے۔ یہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی اور یہی وہ تاریخی سن ہے جو اُن کے دو دَوروں کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتا ہے۔ اس کتاب میں ہم پہلی مرتبہ اُن کا یہ دعویٰ پڑھتے ہیں کہ وہ مثیلِ مسیح اور مسیحِ موعود ہیں[2]۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر تم ایماندار ہو تو شکر کرو اور شکر کے سجدات بجا لاؤ کہ وہ زمانہ

---

[1] اس سلسلہ کی تین کتابیں ہیں، براہینِ احمدیہ، سرمۂ چشم آریہ اور شحنۂ حق۔

[2] مرزا بشیر احمد صاحب نے سیرۃ المہدی میں لکھا ہے: "حضرت مسیح موعود نے ۱۸۹۰ء کے اواخر میں "فتح اسلام" تصنیف فرمائی تھی اور اس کی اشاعت شروع ۱۸۹۱ء میں لدھیانہ سے کی گئی۔ یہ وہ پہلا رسالہ ہے جس میں آپ نے اپنے مثیلِ مسیح ہونے اور مسیح ناصری کی وفات کا ذکر کیا ہے گویا مسیح موعود کے دعوے کا یہ سب سے پہلا اعلان ہے۔" (صفحہ ۳۱، ۹۲، ۹۲۷ حصہ اول) پس اس سے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بھی مثیلِ مسیح اور مسیحِ موعود کو مرسلین اللہ کو مانتے تھے۔

جس کا انتظار کرتے کرتے تمہارے بزرگ آبا گزر گئے اور بے شمار رُوحیں اُس کے شوق میں ہی سفر کر گئیں۔ وُہ وقت تم نے پا لیا، اب اس کی قدر کرنا یا نہ کرنا اور اُس سے فائدہ اُٹھانا یا نہ اُٹھانا تمہارے ہاتھ میں ہے میں اس کو بار بار بیان کروں گا اور اس کے اظہار سے میں رُک نہیں سکتا کہ مَیں وُہی ہوں جو وقت پر اصلاحِ خلق کے لیے بھیجا گیا تا دین کو تازہ طور پر دلوں میں قائم کر دیا جائے۔ مَیں اسی طرح بھیجا گیا ہُوں جس طرح سے وُہ شخص بعد کلیم اللہ مردِ خدا کے بھیجا گیا تھا جس کی رُوح ہیروڈیس کے عہدِ حکومت میں بہت تکلیفوں کے بعد آسمان کی طرف اُٹھائی گئی سو جب دُوسرا کلیم اللہ جو حقیقت میں سب سے پہلا اور سیّد الانبیاءؐ ہے، دُوسرے فرعونوں کی سرکوبی کے لیے آیا جس کے حق میں ہے انّا ارسلنا الیکم رسولًا شاھدًا علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولًا تو اس کو بھی جو اپنی کارروائیوں میں کلیم اوّل کا مثیل مگر رُتبہ میں اس سے بزرگ تر تھا، ایک مثیل المسیح کا وعدہ دیا گیا اور وُہ مثیل المسیح قوت اور طبع اور خاصیت مسیح ابن مریمؑ کی پا کر اسی زمانہ کی مانند اور اسی مُدّت کے قریب قریب جو کلیم اوّل کے زمانہ سے مسیح ابن مریمؑ کے زمانہ تک تھی یعنی چودھویں صدی میں آسمان سے اُترا اور وُہ اُترنا رُوحانی طور پر

تھا جیسا کہ کُل لوگوں کا مقصود کے بعد خلق اللہ کی اصلاح کے لیے نزول ہوتا ہے اور سب باتوں میں ہاسی زمانہ کے ہم شکل زمانہ میں اُترا، جو مسیح ابن مریم کے اُترنے کا زمانہ تھا، تا سمجھنے والوں کے لیے نشان ہو۔[1]

یہ عبارت اگرچہ کافی گنجلک اور اُلجھی ہوئی ہے (اور شاید ایسا قصداً کیا گیا ہے)۔ صراحت کے ساتھ مرزا صاحب کے عقیدہ اور نئے دعویٰ کو ظاہر کرتی ہے اور یہ کہ وہ مثیلِ مسیح ہیں، ان کی تینوں کتابیں "فتح اسلام"، "توضیح مرام" اور "ازالۂ اوہام" جو ۱۸۹۱ء کی تالیف ہیں، اسی موضوع پر ہیں اور ان میں بار بار اسی بات کو دُہرایا گیا ہے۔ اسی کتاب (فتح اسلام) کے دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

"سو اس عاجز کو اور بزرگوں کی فطرتی مشابہت سے علاوہ جس کی تفصیل براہین احمدیہ میں بہ بسط تمام مندرج ہیں۔ حضرت مسیحؑ کی فطرت سے ایک خاص مشابہت ہے اور اسی فطرتی مشابہت کی وجہ سے مسیح کے نام پر یہ عاجز بھیجا گیا تا صلیبی اعتقاد کو پاش پاش کر دیا جائے، سو میں صلیب کے توڑنے اور خنزیروں کے قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ میں آسمان سے اُترا ہوں۔ ان پاک فرشتوں کے ساتھ جو میرے دائیں بائیں تھے۔"[2]

---

[1] فتح اسلام، صفحہ ۱۰ [2] فتح اسلام، حاشیہ صفحہ ۹

انھوں نے اپنی کتاب (توضیح مرام جو "فتح اسلام" کے بعد دوسری تصنیف ہے) کی ابتدا اس صاف و صریح عبارت سے کی ہے۔

"مسلمانوں اور عیسائیوں کا کسی قدر اختلاف کے ساتھ یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح ابن مریمؑ اسی عنصری وجود سے آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں اور پھر وہ کسی زمانہ میں آسمان سے اتریں گے: میں اس خیال کا غلط ہونا اپنے اسی رسالہ میں لکھ چکا ہوں اور نیز یہ بھی بیان کر چکا ہوں کہ اس نزول سے مراد درحقیقت مسیح ابن مریم کا نزول نہیں بلکہ استعارہ کے طور پر ایک مثیل مسیح کے آنے کی خبر دی گئی ہے جس کا مصداق حسب اعلام و الہام الٰہی یہی عاجز ہے۔"[1]

علمی اشکال اور اُن کا حل

حکیم نور الدین صاحب چونکہ احادیث و روایات پر وسیع نظر رکھتے تھے۔ اس لیے وقتاً فوقتاً اُن علمی اشکالات پر متنبہ اور ان دقتوں کی طرف بھی متوجہ کرتے رہتے تھے جو اس دعوٰی کے بعد پیش آتے ہیں اور اُن کے حل میں بھی مدد دیتے تھے۔ اس بارہ میں کہ ان صفات کو جو حضرت مسیح کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں۔ مرزا صاحب کس طرح اپنے اوپر منطبق کریں خاص ذہانت و رہنمائی کی ضرورت تھی۔ یہاں ان اشکالات اور اُن کے حل کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

---

[1] توضیح مرام صفحہ ۲

دمشق کی تشریح

نزولِ مسیح کی روایات میں جن کی بنیاد پر مرزا صاحب نے مسیح موعود کے دعویٰ کی عمارت اٹھائی ہے۔ نزولِ مسیح کی کیفیت اور متعدد تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت مسیح کا نزول دمشق میں ہوگا۔ اب اگر مرزا صاحب مسیح موعود ہیں تو اس اطلاع کے صحیح ہونے کی کیا صورت ہے؟ دمشق اور قادیان میں بہت بڑا فاصلہ ہے اور دونوں کا فرق جغرافیہ کے ایک مبتدی طالب علم بلکہ ایک عامی کو بھی معلوم ہے شاید مرزا صاحب کا ذہن خود اس اشکال کی طرف منتقل نہیں ہوا تھا حکیم نور الدین صاحب نے (جو حدیث کے ایک اچھے طالب علم رہ چکے تھے) ان کو اس الجھن کی طرف متوجہ کیا۔ اب بہتر یہ ہے کہ ہم خود مرزا صاحب کی زبانی سنیں کہ ان کو اس مسئلہ کی طرف کس طرح توجہ ہوئی اور انھوں نے اس کا حل کیا تجویز کیا۔ "ازالۂ اوہام" کے ایک حاشیہ پر لکھتے ہیں:

"یہ عاجز ابھی اس بات (دمشق کی حقیقت) کی تفتیش کی طرف متوجہ نہیں ہوا کہ قصد کیا ہیں کہ اسی اثنا میں میرے ایک دوست اور محبت واثق مولوی حکیم نور الدین صاحب اس جگہ قادیان میں تشریف لائے اور انھوں نے اس بات کے لیے درخواست کی جو مسلم کی حدیث میں لفظ دمشق و نیز اور چند ایسے مجمل الفاظ ہیں۔ ان کے انکشاف کے لیے جناب الٰہی میں توجہ کی جائے۔ چونکہ ان دنوں

میں میری طبیعت علیل اور دماغ ناقابلِ جدوجہد تھا، اس حالت میں ان تمام مقاصد کی طرف توجہ کرنے سے مجبور رہا۔ صرف تھوڑی سی توجہ کرنے سے ایک لفظ کی تشریح یعنی دمشق کے لفظ کی حقیقت مجھ پر کھل گئی۔" [1]

اس کے بعد دمشق کے بارے میں اپنی تحقیق اور انکشاف اس طرح پیش کیا ہے:

"پس واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تاویل میں میرے پر من جانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبہ کا نام دمشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کی عادات و خیالات کے پیرو ہیں، جن کے دلوں میں اللہ و رسول کی کچھ محبت نہیں اور احکامِ الٰہی کی کچھ عظمت نہیں جنھوں نے اپنی خواہشوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اپنے نفسِ امّارہ کے حکموں کے ایسے مطیع ہیں کہ مقدسوں اور پاکوں کا خون بھی ان کی نظر میں سہل اور آسان ہے اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور خدا تعالیٰ کا موجود ہونا ان کی نگاہ میں ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جو انھیں سمجھ نہیں آتا اور کیونکہ طبیب کو بیماروں کی طرف آنا چاہیے، اس لیے ضرور تھا کہ مسیح ایسے ہی لوگوں میں نازل ہو۔" [2]

---

[1] ازالۂ اوہام، صفحہ ۳۲، ۳۳؛ [2] حاشیہ ازالۂ اوہام، صفحہ ۳۳، ۳۴

"پس مسیح کا دمشق میں اُترنا صاف دلالت کرتا ہے کہ کوئی مثیلِ مسیح جو حُسین سے بھی بوجہ مشابہت ان دونوں بزرگوں کی مماثلت رکھتا ہے؛ یزیدیوں کی تنبیہ اور ملزم کرنے کے لیے جو مثیلِ یہود ہیں اُترے گا"۔ [1]

"دمشق کا لفظ محض استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے"۔ [2]

"تب اُس نے مجھ سے کہا کہ یہ لوگ یزیدی الطبع ہیں اور یہ قصبہ (قادیان) دمشق کے مشابہ ہے، سو خُدا تعالیٰ نے ایک بڑے کام کے لیے اس دمشق میں اِس عاجز کو اُتارا۔ بطرف شرقی عند المنارۃ البیضاء من المسجد الذی من دخله کان اٰمنا و تبارك الذی انزلنی فی هٰذا المقام"۔ [3]

دو زرد چادریں

احادیث میں نزولِ مسیح کے وقت کی کیفیات اور واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اُن کو مرزا غلام احمد صاحب اپنے اوپر منطبق کرنے میں ایسی موشگافیوں اور نکتہ آفرینیوں سے کام لیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اپنے قارئین یا سامعین پر یہ اعتماد ہے کہ وُہ بعید سے بعید تاویل اور ناقابلِ فہم نکتہ بھی قبول کرلیں گے۔ مرزا صاحب کے مخالفین نے ان پر اعتراض کیا کہ نزول کی جن احادیث سے وُہ استدلال کرتے ہیں اور اُن پر اپنی دعوت و دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں ان میں یہ بھی تو آیا ہے کہ جس وقت حضرت مسیح نزول

حاشیہ

[1] ازالۂ اوہام، صفحہ ۲۲۔ [2] ایضاً، صفحہ ۲۲ [3] ایضاً، صفحہ ۶۸

فرمائیں گے۔ اُن پر دو زرد چادریں ہوں گی۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں؛

"میں ایک دائم المرض آدمی ہوں اور وہ دو زرد چادریں جن کے بارہ میں حدیثوں میں ذکر ہے کہ ان دو چادروں میں مسیح نازل ہوگا وہ دو زرد چادریں میرے شاملِ حال ہیں جن کی تعبیر علم تعبیر الرؤیا کی رو سے دو بیماریاں ہیں سو ایک چادر میرے اوپر کے حصّہ میں ہے کہ ہمیشہ سر درد اور دورانِ سر اور کمی خواب اور تشنّج دل کی بیماری دورہ کے ساتھ آتی ہے اور دوسری چادر جو میرے نیچے کے حصّہ بدن میں ہے وہ بیماری ذیابیطس ہے کہ ایک مدّت سے دامنگیر ہے، اور بسا اوقات سو سو دفعہ رات کو یا دن کو پیشاب آتا ہے اور اس قدر کثرتِ پیشاب سے جس قدر عوارضِ ضعف وغیرہ ہوتے ہیں وہ سب میرے شاملِ حال رہتے ہیں۔"[۱]

دمشق کا منارۂ شرقی

حدیثوں میں دمشق کے منارۂ شرقی کا بھی ذکر آتا ہے جس پر حضرت مسیح کا نزول ہوگا۔ مرزا غلام احمد صاحب نے دمشق کے لفظ کی طرح اس کی تاویل کی زحمت برداشت کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھا کہ قادیان کے مشرقی حصّہ میں منارہ ہی تعمیر کر دیا جائے۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں اس بات کا فیصلہ کر لیا جیسا کہ سیرۃ المہدی سے معلوم ہوتا ہے اور

---

[۱] ضمیمۂ اربعین نمبر ۳، ۴ صفحہ ۴۔

اس کے لیے چندہ کی فہرست بھی کھول دی اور لوگوں کو اس میں چندہ دینے کی ترغیب دی[1] اور ۱۹۰۳ء میں اس کا سنگِ بنیاد بھی رکھ دیا۔[2] لیکن اس منارہ کی تکمیل اُن کی زندگی میں نہیں ہو سکی۔ یہ سعادت اُن کے صاحبزادے مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کے حصّہ میں آئی۔

طنز و استہزاء

ان تینوں تصنیفات میں مرزا صاحب کی طبیعت کا جوش بہت بڑھ گیا ہے اور اُن کی تحریر میں طنز و تعریض کا ایک ایسا عنصر اور ایسی تلخی آگئی ہے، جس کی وجہ سے یہ کتابیں سنجیدہ بحث و نظر کی کتابوں اور اصلاحی و دعوتی تصنیفات کے بجائے ہجو و طنز کی کتابوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ان کتابوں میں مرزا صاحب نے جو اسلوبِ تحریر اختیار کیا ہے وہ پیغمبروں سے قطع نظر اور مصلحین و مجددین کو بھی چھوڑ کر متین و سنجیدہ مصنفین اور باوقار اہلِ قلم سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ انھوں نے حیات و نزولِ مسیح کے عقیدہ کا اور اس کے ماننے والوں کا جس انداز میں مذاق اُڑایا ہے وہ ایک علمی بزم سے زیادہ اُمراء کے درباروں اور مصاحبوں کی فقرہ بازیوں سے مشابہ ہے، نیز اُن کے اندر جو مجادلانہ طرح اور وکیلانہ موشگافیاں ہیں، اُن کو کلامِ نبوت اور مزاجِ نبوت سے کوئی مناسبت نہیں۔

حضرت مسیح کے آسمان پر اس وقت تک زندہ رہنے کو عقلاً محال ثابت

---

[1] اشتہار چندہ منارۃ المسیح شامل کتاب خطبۂ الہامیہ صفحہ ۱ [2] سیرۃ المہدی حصہ اول صفحہ ۱۵۷

کرتے ہوئے اور اس میں عقلی اشکالات بتلاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

"منجملہ ایک یہ اعتراض کہ اگر ہم فرضِ محال کے طور پر قبول کر لیں کہ حضرت مسیح اپنے جسمِ خاکی کے سمیت آسمان پر پہنچ گئے تو اس بات کے اقرار سے بھی چارہ نہیں کہ وہ جسم جیسا کہ تمام حیوانی و انسانی اجسام کے لیے ضروری ہے آسمان پر بھی تاثیرِ زمانہ سے ضرور متاثر ہوگا اور یہ مرورِ زمانہ لابدی و لازمی طور پر ایک دن ضرور اس کے لیے موت واجب ہوگی۔ پس اس صورتِ حال میں تو حضرت مسیح کی نسبت یہ ماننا پڑتا ہے کہ اپنی عمر کا حصہ پورا کر کے آسمان ہی پر فوت ہو گئے ہیں[1] اور کواکب کی آبادی جو آج کل تسلیم کی جاتی ہے اُسی کے کسی قبرستان میں دفن کیے گئے ہوں گے اور اگر پھر فرض کے طور پر اب تک زندہ رہنا اُن کا تسلیم کر لیں تو کچھ شک نہیں کہ اتنی مدت کے گزرنے

---

[1] مرزا صاحب کے زمانے میں علوم طبیعیہ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اور دوسرے سیاروں اور خلاؤں کے متعلق ایسے تجربات نہیں ہوتے تھے کہ ان کو یہ معلوم ہوتا کہ زمانی و مکانی (Time & Space) کے زمینی قوانین اور پیمانے دوسرے سیاروں اور خلاؤں میں نافذ نہیں اور اس لحاظ سے وقت کا تصور اور اس کا پیمانہ یہاں مختلف اور [illegible] ہے [illegible] یہاں کے ایک ہزار سال وہاں کی ایک ساعت یا لمحہ کے برابر ہو سکتے ہیں، تو اسی طرح سے تغیر و فنا اور حادثات و ضروریات میں دونوں عالم بہت مختلف ہیں۔ انسان کی یہ قدیم کمزوری ہے کہ وہ اپنے معلومات اور تجربات اور اپنے زمانہ کے مشہورات و مسلمات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتا ہے اور ان کی بنا پر بہت سے حقائق کا جو ابھی اس کے علم و تجربہ میں نہیں آئے شدومد سے انکار کرنے لگتا ہے، بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه ولما یأتهم تأویله (یونس ۳۹) بات یہ ہے کہ جھٹلانے لگے ہیں کہ جس کے سمجھنے پر انہوں نے قابو نہ پایا اور ابھی آئی نہیں اس کی حقیقت ۔

پر پیر فرتوت ہو گئے ہوں گے اور اس کام کے ہرگز لائق نہیں ہوں گے کہ کوئی خدمتِ دینی ادا کر سکیں، پھر ایسی حالت میں اُن کا دُنیا میں تشریف لانا بجز ناحق کی تکلیف کے اور کچھ فائدہ بخش نہیں معلوم ہوتا۔[1]

ایک جگہ حدیث کے ٹکڑے و یقتل الخنزیر کے عام فہم معنی پر تعریض کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"کیا حضرت مسیح کا زمین پر اُترنے کے بعد عمدہ کام یہی ہوگا کہ وہ خنزیروں کا شکار کھیلتے پھریں گے اور بہت سے کتے ساتھ ہوں گے، اگر یہی سچ ہے تو پھر سکھوں اور چماروں اور سانسیوں اور گنڈیلوں وغیرہ کو جو خنزیر کے شکار کو دوست رکھتے ہیں خوشخبری کی جگہ ہے کہ اُن کی خوب بن آئے گی۔"[2]

ایک دوسری جگہ نزولِ مسیح کی حقیقت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ایسا نہ ہو کہ کسی غبارہ (بیلون) پر چڑھنے والے اور پھر تمہارے سامنے اُترنے والے کے دھوکے میں آ جاؤ، سو ہوشیار رہنا۔ آئندہ تم اپنے اس بچے ہوئے خیال کی وجہ سے کسی ایسے اُترنے والے کو ابنِ مریم نہ سمجھ بیٹھنا۔"[3]

ایک جگہ عقیدۂ نزولِ مسیح کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"بھائیو، اس بحث کی دو ٹانگیں تھیں،

---

[1] ازالہ اوہام، صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱۔ [2] ایضاً، صفحہ ۲۱۔ [3] ایضاً، صفحہ ۱۴۳

(۱) ایک تو ابن مریم کا آخری زمانہ میں جسم خاکی کے ساتھ آسمان سے اُترنا تو اس ٹانگ کو تو قرآن شریف اور نیز بعض احادیث نے بھی مسیح ابن مریم کے وفات ہو جانے کی خبر دے کر توڑ دی ہے۔

(۲) دوسری ٹانگ دجال معہود کا آخری زمانہ میں ظاہر ہونا تھا، سو اس ٹانگ کو صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی متفق علیہ حدیثوں نے جو صحابہ کبار کی روایت سے ہیں دو ٹکڑے کر دیا اور ابن صیاد کو دجال معہود ٹھیرا کر آخر مسلمانوں کی جماعت میں داخل کر کے مار بھی دیا، اب جب کہ اس بحث کی دو ٹانگیں ٹوٹ گئیں تو پھر اب تیرہ سو برس کے بعد یہ مردہ جس کے دونوں پیر نہیں، کیوں اور کس کے سہارے سے کھڑا ہو سکتا ہے۔"[۱]

ایک دوسری جگہ اسی تمسخر کے انداز میں لکھتے ہیں:

" کیا احادیث پر اجماع ثابت ہو سکتا ہے کہ مسیح آکر جنگلوں میں خنزیروں کا شکار کھیلتا پھرے گا اور دجال خانہ کعبہ کا طواف کریگا اور ابن مریم بیماروں کی طرح دو آدمیوں کے کاندھے پر ہاتھ دھر کے فرض طواف کعبہ بجا لائے گا۔ کیا معلوم نہیں کہ جو لوگ ان حدیثوں کی شرح کرنے والے گزرے ہیں، وہ کیسے بے ٹھکانا اپنی ٹکیں ہانک

---

[۱] ازالۂ اوہام صفحہ ۱۳۳، ۱۳۴

رہے ہیں۔[1]

ایک دوسری جگہ علمائے اہل سنت کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"اے حضرات مولوی صاحبان! جبکہ عام طور پر قرآن شریف سے مسیح کی وفات ثابت ہوتی ہے اور ابتدا سے آج تک بعض اقوال صحابہ و مفسرین بھی اس کو مارتے ہی چلے آتے ہیں تو آپ لوگ ناحق کی ضد کیوں کرتے ہیں۔ کہیں عیسائیوں کے خدا کو مرنے بھی دو۔ کب تک اس کو حی لایموت کہتے جاؤ گے، کچھ انتہا بھی ہے۔"[2]

اپنے دور کے طبیعیاتی تحقیقات سے مرعوبیت

مرزا صاحب کی اس دور کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے علوم طبیعیات کے ان معلومات سے بہت مرعوب ہیں جن کا اس زمانہ میں ہندوستان میں نیا نیا چرچا ہوا تھا حالانکہ علوم طبیعیہ اس وقت یورپ میں بھی دور طفولیت میں تھے اور مرزا صاحب کی معلومات اس سلسلہ میں اور بھی سرسری اور (Second hand) ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقیدۂ نزول مسیح کے انکار کا ایک بڑا محرک یہی ہے کہ یہ عقیدہ سائنس کی جدید معلومات و مسلمات سے مطابقت نہیں رکھتا اور یہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے تضحیک کا باعث ہوگا۔ ازالۂ اوہام میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس فلسفی الطبع زمانہ میں جو عقلی شائستگی اور ذہنی تیزی اپنے ساتھ

---

[1] ازالۂ اوہام صفحہ ۲۱۳ [2] ازالۂ اوہام صفحہ ۴۳۵

رکھتا ہے۔ ایسے عقیدہ کے ساتھ دین کا میابی کی امید رکھنا ایک بڑی بھاری
غلطی ہے۔[1] اگر افریقہ کے ریگستان یا عرب کے صحرانشینوں اور بدوؤں
میں یا سمندر کے جزیروں کے اور وحشی لوگوں کی جماعتوں پر ایسے بے سروپا
باتیں پھیلائیں تو شاید آسانی سے پھیل سکیں۔ لیکن ہم ایسی تعلیمات کو
جو عقل و تجربہ اور طبعی اور فلسفہ سے بکلی مخالف اور نیز ہمارے نبی
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ثابت نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ اُن کے
مخالف حدیثیں ثابت ہو رہی ہیں، تعلیم یافتہ لوگوں میں ہرگز نہیں
پھیلا سکتے۔ اور نہ یورپ و امریکہ کے محقق طبع لوگوں کی طرف جو اپنے
دین کی لغویات سے دست بردار ہو رہے ہیں بطور ہدیہ اور تحفہ
بھیج سکتے ہیں، جن لوگوں کے دل و دماغ کو نئے علوم کی روشنی نے
انسانی قوتوں میں ترقی دے دی ہے وہ ایسی باتوں کو کیونکر تسلیم کر
لیں گے جن میں سراسر خدائے تعالیٰ کی توہین اور اس کی توحید کی اہانت
اور اس کے قانون قدرت کا ابطال ہو اور اس کے کتابی اصول کی تنسیخ پائی جاتی ہے۔[2]

اس طرح کی تنقیدات کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا "سرمہ چشم آریہ"

---

[1] معلوم نہیں مرزا صاحب نے دین کے حقائق غیبیہ وحی، ملائکہ، جنت و نار وغیرہ کے معتقدات اور ان کی تبلیغ کو کس طرح گوارا فرمایا اور دین کے مطالبۂ ایمان بالغیب کو جو دین کی روح اور ہدایت کی شرط اساسی ہے کس طرح قبول کیا۔ اقتباس بالا سے اس ذہنی مرعوبیت اور علوم جدید کی تقدیس کا اظہار ہوتا ہے جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں علی الخصوص مستشرقین اور نیم تعلیم یافتہ اصحاب کا شعار بن گئی تھی۔

[2] ازالۂ اوہام، صفحہ ۱۳۵

کا مصنف نہیں ہے جس نے معجزات کے امکان و وقوع پر زوردار بحث کی ہے اور اس سے انکار کیا ہے کہ عقل اور محدود انسانی تجربوں کی بنا پر ان مافوق الطبیعیات چیزوں کا انکار کرنا درست ہے۔

جُمّل کے حساب سے استدلال

اس کتاب میں مرزا صاحب نے جمل کے اعداد سے بھی بہت استدلال کیا ہے اور یہاں آن کا انداز باطنی مصنفین اور داعیوں سے مل جاتا ہے، جو اعداد جمل سے بڑے بڑے دینی حقائق اور عقائد ثابت کرتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

"مجھے کشفی طور پر مندرجہ ذیل نام کے اعداد حروف کی طرف توجہ دلائی گئی کہ دیکھ یہی مسیح ہے کہ جو تیرھویں صدی کے پورے ہونے پر ظاہر ہونے والا تھا۔ پہلے سے یہی تاریخ ہم نے نام میں مقرر کر رکھی تھی اور وہ یہ نام ہے "مرزا غلام احمد قادیانی" اس نام کے عدد پورے تیرہ سو ہیں اور اس قصبۂ قادیان میں بجز اس عاجز کے اور کسی شخص کا غلام احمد نام نہیں بلکہ میرے دل میں ڈالا گیا ہے کہ اس وقت بجز اس عاجز کے تمام دنیا میں غلام احمد قادیانی کسی کا بھی نام نہیں اور اس عاجز کے ساتھ اکثر یہ عادت اللہ جاری ہے کہ وہ سبحانہ بعض اسرار اعداد حروف تہجی میں میرے پر ظاہر کر دیتا ہے۔"[1]

---

[1] ازالۂ اوہام، صفحہ ۹۰

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"اب اس تحقیق سے ثابت ہے کہ مسیح ابن مریم کی آخری زمانے میں آنے کی قرآن شریف میں پیشگوئی موجود ہے۔ قرآن شریف میں جو مسیح کے نکلنے کی چودہ سو برس مدت ٹھیرائی ہے۔ بہت سے اولیاً بھی اپنے مکاشفات کی رُو سے اس مدت کو مانتے ہیں اور آیت وانا علی ذھاب بہ لقادرون[1] جس کے بحساب جمل ۱۲۷۴ عدد ہیں۔ اسلامی چاند کی سلخ کی راتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں نئے چاند کے نکلنے کی اشارت چھپی ہوئی ہے، جو غلام احمد قادیانی کے عددوں میں بحساب جمل پائی جاتی ہے[2]"

ان کتابوں میں مرزا صاحب نے احادیث میں آئے ہوئے الفاظ و کلمات کی تشریح و تاویل اور ان کا مصداق تجویز کرنے میں ایسی فیاضی اور بے تکلفی سے کام لیا ہے جو کسی مصنف اور شاعر کے لیے اپنے کلام کی تشریح میں بھی مشکل ہے، انھوں نے ان تمام الفاظ کو مجازات و استعارات قرار دے دیا ہے اور ان باطنیہ متقدمین کی یاد تازہ کر دی ہے جو دینی اصطلاحات اور ان شرعی الفاظ کے (جن کے لفظ اور معنی دونوں تواتر سے چلے آرہے ہیں) ایسے دُور

---

[1] واضح رہے کہ سورۃ مومنون کی یہ آیت آسمانی بخشش کے متعلق ہے پوری آیت اس طرح ہے وانزلنا من السماء ماءً بقدرٍ فاسکنٰہ فی الارض وانا علی ذھاب بہ لقادرون [2] ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۳۳۸

ادکار اور مُضحکہ خیز معنی بیان کرتے تھے جن کے لیے دُور کی لغوی مجنسیاد تھی، نہ عقل، اور اس طرح اُمّت میں الحاد و فساد کا ایک بڑا دروازہ کھول دیا تھا، مرزا صاحب نے ازالۂ اوہام میں بار بار تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ابن مریم اور دجّال کی حقیقت پورے طور پر واضح نہیں ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا صرف اجمالی علم عطا کیا تھا۔[1]

حضرت مسیح کشمیر میں

مرزا صاحب وفاتِ مسیح کے بارہ میں برابر "غور و خوض" کرتے رہتے یہاں تک کہ آخر میں اُن کی تحقیق یہ ہوئی کہ ان کا انتقال کشمیر میں ہوا اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے حسبِ عادت بڑی باریک باتیں پیدا کی ہیں جو اُن کی مضمون آفرینی کی دلیل ہیں۔ اُنھوں نے ثابت کیا ہے کہ کشمیری زبان میں کشمیر کا تلفظ "کشیر" ہے اور پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں عبرانی زبان کا ہے جو دو چیزوں سے مرکب ہے، ایک "ک" جو مماثلت و تشبیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ایک "اشیر" جس کے معنی عبرانی زبان میں "شام" کے ہیں یعنی شام کی طرح۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فلسطین سے ہندوستان کے اس علاقہ کی طرف ہجرت کی جو اپنی آب و ہوا کی خوبی، موسم کی خوشگواری اور سرسبزی و شادابی میں شام سے بہت مشابہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو تسلّی دینے اور اُن کا

---

[1] ازالۂ اوہام حصّہ دوم، صفحہ ۳۴۶

دل خوش کرنے کے لیے اس کا نام "کاشیر" رکھ دیا۔ الف کثرتِ استعمال سے ساقط ہو گیا اور وہ "کشمیر" بن گیا۔ پھر انھوں نے ثابت کیا ہے کہ سری نگر کے محلہ خان یار میں "یوذ اسف" کی قبر کے نام سے جو قبر مشہور ہے، وہ حضرت مسیح ہی کی قبر ہے جن کو شاہزادہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اپنی اس نادر تحقیق کو ثابت کرنے اور یوذ اسف اور اُن کی قبر کو حضرت مسیح کی قبر قرار دینے میں ایسی خیال آرائی اور نکتہ آفرینی سے کام لیا ہے کہ وہ ایک علمی تحقیق سے زیادہ شاعری اور افسانہ نویسی معلوم ہونے لگتی ہے اور مستشرقین جو رائی کو پہاڑ بنانے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں، اُن کے سامنے گرد نظر آنے لگتے ہیں۔[1]

اس مقام پر پہنچ کر مرزا صاحب کے رُوحانی تجربات اور دعاوی کی ایک منزل طے ہو جاتی ہے۔ وہ اس منزل پر "مسیح موعود" ہونے کے مدعی ہیں اور اس کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو براہین احمدیہ، صفحہ ۲۲۸۔

فصل سوم

مسیح موعود کے دعویٰ سے نبوت تک

ایک مرتب خاکہ مرزا صاحب کی تصنیفات کا غیر جانبدارانہ مگر ناقدانہ مطالعہ کرنے سے پڑھنے والے کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان کے الہامات اور دعاوی کے تدریجی منازل ایک مرتب اسکیم اور خاکے کے ماتحت ہیں اور انھوں نے ان منزلوں کے طے کرنے اور ان کا اعلان کرنے میں تجربے صبر و تحمل اور احتیاط سے کام لیا۔ وہ الہام علم باطنی اور علم یقینی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کامل کا لازمی نتیجہ اور ایک قدرتی منزل قرار دیتے ہیں جو فنائیت فی الرسول کے بعد لازمی طور پر پیش آتی ہے۔ وہ نبوت اور نبی کا لفظ صاف صاف زبان سے کہے بغیر صفات نبوت اور خصائص نبوت پر گفتگو کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ صفات افراد امت اور کملائے امت کو بطریق تبعیت و وساطت حاصل ہوتی ہیں۔ اس منطق اور ان مقدمات کا طبعی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ ایک دن مرزا صاحب نبوت کا دعویٰ کردیں اور اس کی اپنی زبان سے تصریح کر دیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے

لیے مناسب ماحول اور مناسب تقریب کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اس کا اطمینان کر لینا چاہتے تھے کہ کیا لوگوں کی عقیدت اور اُن کا جذبۂ اطاعت اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ وہ ان کے دوسرے دعاوی کی طرح اس کو بھی قبول کر لیں گے؟

اعلان اور صراحت

بالآخر یہ واقعہ پیش آگیا۔ یہ ۱۹۰۰ء کی بات ہے مولوی عبدالکریم صاحب نے جو جمعہ کے خطیب تھے، ایک خطبہ جمعہ پڑھا جس میں مرزا صاحب کے لیے نبی اور رسول کے الفاظ استعمال کیے۔ اس خطبہ کو سُن کر مولوی سید محمد احسن صاحب امروہی نے بہت پیچ و تاب کھائے۔ جب یہ بات مولوی عبدالکریم صاحب کو معلوم ہوئی تو پھر انھوں نے ایک خطبہ پڑھا اور اس میں مرزا صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر میں غلطی کرتا ہوں تو حضور مجھے بتلائیں۔ میں حضور کو نبی اور رسول مانتا ہوں۔ جب جمعہ ہو چکا اور مرزا صاحب جانے لگے تو مولوی صاحب نے پیچھے سے مرزا صاحب کا کپڑا پکڑ لیا اور درخواست کی کہ اگر میرے اس اعتقاد میں غلطی ہو تو حضور درست فرمائیں۔ مرزا صاحب مُڑ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا، مولوی صاحب ہمارا بھی یہی مذہب اور دعویٰ ہے جو آپ نے بیان کیا۔ یہ خطبہ سُن کر مولوی محمد احسن صاحب غصہ میں بھرے واپس آئے اور مسجد کے اُوپر ٹہلنے لگے۔ جب مولوی عبدالکریم صاحب واپس آئے، تو

مولوی محمد احسن صاحب ان سے لڑنے لگے۔ آواز بہت بلند ہو گئی تو مرزا صاحب مکان سے نکلے اور یہ آیت پڑھی "یاایھا الذین اٰمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی"[1]۔

اس طرح مولوی عبدالکریم صاحب کے اعلان خطبہ سے اس نئے دور کا افتتاح ہو گیا اور مرزا صاحب کو معلوم ہو گیا کہ لوگ اتنے راسخ الایمان ہو چکے ہیں کہ وہ اُن کے ہر دعویٰ کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ مرزا صاحب کے بڑے صاحبزادے مرزا بشیر الدین محمود نے بڑی خوبی سے اس حقیقت کو ظاہر کیا ہے کہ مرزا صاحب اپنے کو ان صفات سے موصوف کرتے تھے جو غیر انبیاء میں پائی ہی نہیں جا سکتیں۔ پھر بھی وہ نبوت کا انکار کرتے تھے لیکن اُن کو جب اس تضاد کا احساس ہوا اور اُن کو یہ اندازہ ہوا کہ ان صفات میں اور ان دعاوی میں جو وہ ابھی تک کرتے رہے ہیں مطابقت نہیں ہے تو انھوں نے اپنی نبوت کا کھلا اعلان کر دیا۔ مرزا محمود صاحب لکھتے ہیں:

"خلاصہ کلام یہ کہ حضرت مسیح موعود چونکہ ابتداءً نبی کی تعریف یہ خیال فرماتے تھے کہ نبی وہ ہے جو نئی شریعت لائے یا بعض حکم منسوخ کرے یا بلا واسطہ نبی ہو۔ اس لیے باوجود اس کے کہ وہ سب

---

[1] ماخوذ از تقریر سید سرور شاہ صاحب قادیانی، جلسہ سالانہ قادیان، مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد ۱۰، نمبر ۵۱ مورخہ ۴ جنوری ۱۹۲۳ء نیز ملاحظہ ہو حقیقت النبوۃ صفحہ ۱۲۴

شرائط جو نبی کے لیے واقع میں ضروری ہیں آپ میں پائی جاتی تھیں آپ نبی کا نام اختیار کرنے سے انکار کرتے تھے اور گو اِن ساری باتوں کا دعویٰ کرتے رہے جن کے پائے جانے سے کوئی شخص نبی ہو جاتا ہے لیکن چونکہ آپ ان شرائط کو نبی کی شرائط نہیں خیال کرتے تھے، بلکہ محدّث کے شرائط سمجھتے تھے، اس لیے اپنے آپ کو محدّث کہتے رہے اور نہیں جانتے تھے کہ میں دعویٰ کی کیفیت تو وہ بیان کرتا ہوں جو نبیوں کے سوا اور کسی میں پائی نہیں جاتیں اور نبی ہونے سے انکار کرتا ہوں لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ جو کیفیت اپنے دعوے کی آپ شروع دعویٰ سے بیان کرتے چلے آتے ہیں، وہ کیفیت نبوت ہے نہ کہ کیفیت محدثیت، تو آپ نے اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا ہے۔[1]"

بہر حال خواہ مرزا صاحب کے اتنے عرصہ تک صاف دعوائے نبوت نہ کرنے کی وجہ یہ ہو کہ اُن کے خیال میں نبی کے لیے نئی شریعت لے کر آنا اور بعض احکامِ سابقہ کو منسوخ کرنا اور نبوت کا بلا واسطہ ہونا ضروری تھا۔ یہاں تک کہ اُن کی یہ غلط فہمی دُور ہوئی اور خدا نے اُن کو اس اعلان پہ مامور کیا، یا اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے نزدیک ابھی اس کا وقت نہیں

---

[1] حقیقۃ النبوۃ حصہ اوّل از مرزا بشیر الدین محمود صفحہ ۱۲۴

آیا تھا اور ان کو اس کے لیے مناسب وقت اور ماحول کا انتظار تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بالآخر اس طبعی نتیجہ تک پہنچ گئے جس پر اُن کو اپنے ان دعاوی کے بعد پہنچنا چاہیے تھا۔

تصریحات اور چیلنج

جیسا کہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب کا بیان ہے، سنہ ۱۹۰۰ء سے یہ بات طے ہوگئی اور مرزا صاحب اپنی تصنیفات میں اس کو بصراحت لکھنے لگے۔ اُن کے رسائل کا وہ مجموعہ جس کا نام اربعین[۱] ہے، منصب جدید کے اعلانات اور تصریحات سے بھرا ہوا ہے۔ مرزا صاحب کی صاف گوئی اور صراحت بڑھتی چلی گئی۔ انھوں نے سنہ ۱۹۰۲ء میں ایک رسالہ تحفۃ الندوہ کے نام سے لکھا جس کے مخاطب مجلس ندوۃ العلماء کے ارکان اور وہ تمام علماء تھے جو ندوہ کے اجلاس امرتسر (منعقدہ ۱۹۰۲ء) میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ مرزا صاحب اس رسالہ میں لکھتے ہیں:

"پس جیسا کہ میں نے بار بار بیان کر دیا ہے کہ یہ کلام جو میں سناتا ہوں یہ قطعی اور یقینی طور پر خدا کا کلام ہے جیسا کہ قرآن اور

---

[۱] مرزا صاحب نے ابتدا میں اپنے قارئین سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چالیس کی تعداد میں رسائل لکھیں گے لیکن انھوں نے چار نمبروں پر اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔ اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں "درحقیقت وہ امر پورا ہو چکا جس کا میں نے ارادہ کیا تھا۔ اس لیے میں نے ان رسائل کو صرف چار نمبر پر ختم کر دیا اور آئندہ شائع نہیں ہوگا۔ جس طرح ہمارے خدائے عزوجل نے اوّل پچاس نمازیں فرض کیں پھر تخفیف کر کے پانچ کو بجائے پچاس کے قرار دے دیا۔ اسی طرح میں بھی اپنے رب کریم کی سنت پر ناظرین کے لیے تخفیف تصدیع کر کے نمبر ۴ کو بجائے نمبر چالیس کے قرار دیتا ہوں" (اربعین نمبر ۴ صفحہ ۱۲)

توریت خدا کا کلام ہے اور میں خدا کا ظلّی[1] اور بروزی[2] طور پر نبی ہوں اور ہر ایک مسلمان کو دینی امور میں میری اطاعت واجب ہے اور ہر ایک جس کو میری تبلیغ پہنچ گئی ہے گو وہ مسلمان ہے مگر مجھے اپنا حَکَم نہیں ٹھیراتا اور نہ مجھے مسیح موعود مانتا ہے اور نہ میری وحی کو خدا کی طرف سے جانتا ہے وہ آسمان پر قابلِ مواخذہ ہے کیونکہ جس امر کو اس نے اپنے وقت پر قبول کرنا تھا رد کر دیا۔ میں صرف یہ نہیں کہتا کہ میں اگر جھوٹا ہوتا تو ہلاک کیا جاتا بلکہ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ موسیٰ اور عیسیٰ اور داؤد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح میں سچا ہوں اور میری تصدیق کے لیے خدا نے دس ہزار سے بھی زیادہ نشان دکھلاتے ہیں۔ قرآن نے میری گواہی دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گواہی دی ہے۔ پہلے نبیوں نے میرے آنے کا زمانہ متعین کر دیا ہے کہ جو یہی زمانہ ہے اور قرآن بھی میرے آنے کا زمانہ متعین کرتا ہے کہ جو یہی زمانہ ہے اور میرے لیے آسمان نے بھی گواہی دی ہے اور زمین نے بھی۔ اور کوئی نبی نہیں

---

[1] یعنی محمدیت سے وحی پانے کو مرزا صاحب ظلّی نبوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "حقیقت الوحی" صفحہ ۲۸

[2] "ایک غلطی کا ازالہ" میں مرزا صاحب لکھتے ہیں: "وہ اپنی ذات سے نہیں بلکہ اپنے نبی کے سرچشمے سے لیتا ہے اور نہ اپنے لیے بلکہ اسی کے جلال کے لیے۔ اسی لیے اس کا نام آسمان پر محمد اور احمد ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ محمد کی نبوت آخر محمد ہی کو ملی گو بروزی طور پر مگر نہ کسی اور کو" (صفحہ ۵)

جو میرے لیے گواہی نہیں دے سکتا۔[۱]

اسی طرح حقیقۃ الوحی میں لکھتے ہیں:

"غرض اس حصہ کثیر وحی الٰہی اور امور غیبیہ میں اس امت سے میں ہی ایک فرد مخصوص ہوں اور جس قدر مجھ سے پہلے اولیا اور ابدال اور اقطاب اس امت میں سے گزر چکے ہیں ان کو یہ حصہ کثیر اس نعمت کا نہیں دیا گیا۔[۲] پس اس وجہ سے نبی کا نام پانے کے لیے میں ہی مخصوص کیا گیا اور دوسرے تمام لوگ اس نام کے مستحق نہیں۔"[۳]

مرزا صاحب کی تمام مابعد تصنیفات ان تصریحات اور غیر مشتبہ عبارتوں سے لبریز ہیں جن کا اس مختصر کتاب میں استیعاب ممکن نہیں۔ جس کو مزید تفصیل اور تحقیق کی ضرورت ہو، اس کو مرزا صاحب کی کتاب حقیقۃ الوحی اور مرزا بشیر الدین کی کتاب حقیقۃ النبوۃ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مستقل نبوت مرزا صاحب کی تصنیفات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے نبی مستقل صاحب شریعت ہونے کے بھی قائل تھے۔ انھوں نے "اربعین" میں تشریعی یا صاحب شریعت نبی کی تعریف

---

[۱] تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۸ [۲] یہ مرزا صاحب کا محض دعویٰ ہے جو سراسر تاریخی ناواقفیت اور کوتاہ علمی پر مبنی ہے۔ امت محمدیہ میں اتنی بڑی تعداد میں جن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا ایسے اولیائے کبار گزرے ہیں جن پر بارش کی طرح فیض جاری رہا، الہامات ربانی اور علوم و معارف کا فیضان ہوا لیکن ان میں کسی نے بھی اس کو وحی الٰہی کا نام نہیں دیا اور نبوت کا دعویٰ کیا۔
[۳] حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۹۱۔

کی ہے کہ جس کی وحی میں امر و نہی ہو اور وہ کوئی قانون مقرر کرے ۔ اگرچہ یہ امر و نہی کسی نبی سابق کی کتاب میں پہلے آ چکے ہوں ۔ ان کے نزدیک صاحب شریعت نبی کے لیے اس کی شرط نہیں کہ وہ بالکل جدید احکام لائے ۔ پھر وہ صاف صاف دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس تعریف کے مطابق صاحب شریعت اور مستقل نبی ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

" ماسوا اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے ؟ جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر و نہی بیان کیے اور اپنی اُمت کے لیے ایک قانون مقرر کیا ، وہی صاحب الشریعت ہو گیا ۔ پس اس تعریف کی رُو سے بھی ہمارے مخالف مُلزم ہیں ۔ کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہیں اور نہی بھی ۔ مثلاً یہ الہام " قل للمومنين يغضوا من ابصارهم و يحفظوا فروجهم ذلك ازكى لهم " یہ براہین احمدیہ میں درج ہے اور اس میں امر بھی ہے اور نہی بھی ۔ اور اس پر تئیس برس کی مدت بھی گزر گئی اور ایسا ہی اب تک میری وحی میں امر بھی ہوتے ہیں اور نہی بھی ، اور اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مراد ہے جس میں نئے احکام ہوں تو یہ باطل ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ان هذا لفی الصحف الاولی صحف ابراهيم و موسیٰ ، یعنی قرآنی تعلیم

توریت میں بھی موجود ہے۔"

بعض اہم قطعی و متواتر احکام شریعت کو پوری صراحت و قوت کے ساتھ منسوخ و کالعدم کر دینا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے کو ایسا صاحب شریعت اور صاحب امر و نہی نبی سمجھتے تھے جو قرآنی شریعت کو منسوخ کر سکتا ہے۔ چنانچہ جہاد جیسے منصوص قرآنی حکم کو جس پر امت کا تعامل اور تواتر ہے اور جس کے متعلق صریح حدیث ہے "الجھاد ماضٍ الیٰ یوم القیامۃ" کی ممانعت کرنا اور اس کو منسوخ قرار دینا اس کا روشن ثبوت ہے۔ جہاد کی منسوخی و ممانعت کے سلسلہ میں یہاں پر صرف ایک اقتباس کافی ہوگا۔ اربعین ۴ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

"جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدت کو خدا تعالیٰ آہستہ آہستہ کم کرتا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کے وقت میں اس قدر شدت تھی کہ ایمان لانا بھی قتل سے بچا نہیں سکتا تھا اور شیر خوار بچے بھی قتل کیے جاتے تھے۔ پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بچوں، بڈھوں اور عورتوں کا قتل کرنا حرام کیا گیا اور پھر بعض قوموں کے لیے بجائے ایمان کے صرف جزیہ دے کر مواخذہ سے نجات پانا قبول کیا گیا اور پھر مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف

لہ اربعین ۴ ، صفحہ ، ۶

کر دیا گیا۔[1]

منکرینِ نبوّت کی تکفیر اور اُن کے ساتھ کفار کا سا معاملہ

دعوئے نبوت کا قدرتی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جو اس جدید نبوت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کی تکفیر کی جائے۔ خود مرزا صاحب نے اس کو صرف نبی تشریعی ہی کا حق تسلیم کیا ہے کہ اس کے نہ ماننے والوں کی تکفیر کی جائے، وہ لکھتے ہیں:

"یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اپنے دعویٰ سے انکار کرنے والے کو کافر کہنا یہ صرف ان نبیوں کی شان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت اور احکامِ جدیدہ لاتے ہیں لیکن صاحبِ شریعت کے ماسوا جس قدر مُلہَم اور محدّث ہیں، گو وہ کیسے ہی جنابِ الٰہی میں اعلیٰ شان رکھتے ہوں اور خلعتِ مکالمہِ الٰہیہ سے سرفراز ہوں اُن کے اِنکار سے کوئی کافر نہیں بن سکتا۔"[2]

اس کے بعد مرزا صاحب کی تصنیفات ان سب لوگوں کی تکفیر سے جو ان پر ایمان نہیں رکھتے بھری ہوئی ہیں۔ یہاں پر صرف چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ مرزا صاحب براہینِ احمدیہ کے حصّہ پنجم میں تحریر فرماتے ہیں:

"انھیں دنوں میں آسمان سے ایک فرقہ کی بنیاد ڈالی جائے گی

---

[1] اربعین نمبر ۴۔ حاشیہ صفحہ ۱۵ • جہاد کی منسوخی اور حرمت کے متعلق مرزا صاحب کے واضح اور مفصل بیانات باب سوم کی فصل دوم میں ملاحظہ ہوں [2] تریاق القلوب صفحہ ۱۳۰ حاشیہ •

اور خدا اپنے منہ سے اس فرقہ کی حمایت کے لیے ایک کرنا بجائے گا اور اس کرنا کی آواز سے ہر ایک سعید اس فرقہ کی طرف کھنچا آئے گا بجز اُن لوگوں کے جو شقی ازلی ہیں جو دوزخ کے بھرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔[1]

مرزا صاحب کے الہام میں جو آپ نے ۲۵ مئی سنہ ۱۹۰۰ء کو شائع کیا ہے۔ کہا گیا ہے:

"مجھے الہام ہوا ہے کہ جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا، وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا جہنمی ہوگا۔"[2]

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

"خدائے تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک وہ شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اُس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے وہ مسلمان نہیں ہے۔"[3]

حقیقۃ الوحی میں فرماتے ہیں:

"کفر دو قسم پر ہے: (اوّل) ایک یہ کفر کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا

---

[1] براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۸۲، ۸۳ [2] معیار الاخیار صفحہ ۸ (ماخوذ از قادیانی مذہب) [3] از ذکر الحکیم نمبر ۴ صفحہ ۲۴ مرتبہ ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب منقول از اخبار الفضل مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۳۵ء

کا رسُول نہیں مانتا۔ (دوم) دُوسرے یہ کفر کہ وُہ مثلاً مسیح موعُود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسُول نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لیے کہ وہ خدا اور رسُول کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں کیونکہ جو شخص باوجود شناخت کر لینے کے خُدا اور رسُول کے حُکم کو نہیں مانتا، وُہ بموجب نصوصِ صریحہ قرآن و حدیث کے خدا اور رسُول کو بھی نہیں مانتا۔[1]

اور یہی مرکزی قادیانی جماعت کا عقیدہ ہے۔ اس کے امیر و قائد مرزا بشیرالدین محمود صاحب اپنی کتاب "آئینہ صداقت" میں فرماتے ہیں:

"کُل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انھوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سُنا، وُہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔"[2]

اس سلسلہ میں خلیفہ بشیرالدین صاحب اور قادیانی جماعت کے ذمہ دار حضرات کی تصریحات کا احاطہ مشکل ہے۔ اس کے لیے مرزا بشیر احمد صاحب کی کتاب کلمۃ الفصل کا مُطالعہ کافی ہوگا۔

---

[1] حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۷۹، ۱۸۰ [2] آئینۂ صداقت صفحہ ۳۵ (ماخوذ از قادیانی مذہب)

غیر احمدی مسلمانوں کو کافر سمجھنے کی بنیاد پر مستند قادیانی جماعت نے ان پر کفار کے تمام فقہی احکام جاری کیے۔ چنانچہ قادیانیوں کو ممانعت ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات رکھیں۔ مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے ایک تقریر میں فرمایا "حضرت مسیح موعود کا حکم اور زبردست حکم ہے کہ کوئی احمدی غیر احمدی کو اپنی لڑکی نہ دے۔ اس کی تعمیل کرنا بھی ہر ایک احمدی کا فرض ہے[1]" اور انوارِ خلافت میں فرماتے ہیں "اور آپ (مرزا غلام احمد صاحب) سے ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا۔ مگر آپ نے اس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو۔ آپ کی وفات کے بعد اس نے لڑکی غیر احمدیوں کو دے دی تو حضرت خلیفۂ اول حکیم نور الدین نے اس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا[2]"۔

ایک جگہ اس حکم کی مزید تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"غیر احمدیوں کی ہمارے مقابلہ میں وہی حیثیت ہے جو قرآن حکیم ایک مومن کے مقابلہ میں اہلِ کتاب کی قرار دے کر یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایک مومن اہلِ کتاب عورت کو بیاہ لا سکتا ہے مگر مومنہ عورت کو اہلِ کتاب سے نہیں بیاہ سکتا۔ اسی طرح ایک احمدی

---

[1] برکاتِ خلافت مجموعہ تقاریر مرزا بشیر الدین محمود صاحب خلیفۂ قادیان صفحہ ۷۵ (ماخوذ از قادیانی مذہب) [2] انوارِ خلافت صفحہ ۹۳، ۹۴۔

غیر احمدی عورت کو اپنے حبالۂ عقد میں لا سکتا ہے مگر احمدی عورت شریعت اسلام کے مطابق غیر احمدی مرد کے نکاح میں نہیں دی جا سکتی۔ حضور (مرزا صاحب) فرماتے ہیں "غیر احمدی کی لڑکی لے لینے میں حرج نہیں ہے۔ کیونکہ اہلِ کتاب عورتوں سے بھی نکاح جائز ہے بلکہ اس میں تو فائدہ ہے کہ ایک اور انسان ہدایت پاتا ہے اپنی لڑکی کسی غیر احمدی کو نہیں دینی چاہیے۔ اگر ملے تو بیشک لو۔ لینے میں حرج نہیں، دینے میں گناہ ہے[1]۔"

اسی طرح سے غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنا اُن کے نزدیک درست نہیں۔ خود مرزا صاحب نے اربعین کے حاشیہ میں لکھا ہے:

"اس کلامِ الٰہی سے ظاہر ہے کہ تکفیر کرنے والے اور تکذیب کی راہ اختیار کرنے والے ہلاک شدہ قوم ہے۔ اس لیے وہ اس لائق نہیں ہے کہ میری جماعت میں سے کوئی شخص اُن کے پیچھے نماز پڑھے، کیا زندہ مُردہ کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے۔ پس یاد رکھو جیسا کہ خدا نے مجھے اطلاع دی ہے تمہارے پر حرام ہے ....

.... اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفّر اور مکذّب یا متردّد کے پیچھے نماز پڑھو[2]۔"

---

[1] الحکم، ۱۴ اپریل ۱۹۰۸ء (ماخوذ از قادیانی مذہب)   [2] اربعین نمبر ۳، صفحہ ۳۴ حاشیہ

اسی طرح سے اُن کو مسلمانوں کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی بھی ممانعت ہے، اخبار الفضل (۱۵ دسمبر ۱۹۲۱ء) میں ہے: "حضرت مرزا صاحب نے اپنے بیٹے (فضل احمد صاحب مرحوم) کا جنازہ اس لیے نہیں پڑھا کہ وُہ غیر احمدی تھے میاں بشیر الدین احمد صاحب ایک مکتوب میں جو اخبار الفضل (۱۳ اپریل ۱۹۲۶ء) میں درج ہوا ہے لکھتے ہیں: "میرا یہ عقیدہ ہے کہ جو لوگ غیر احمدیوں کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، ان کا جنازہ جائز نہیں کیونکہ میرے نزدیک وُہ احمدی نہیں ہے۔ اُنھوں نے یہاں تک فتویٰ دیا ہے کہ غیر احمدی بچے کا بھی جنازہ پڑھنا درست نہیں[1] جس طرح عیسائی بچے کا جنازہ نہیں پڑھا جا سکتا اگرچہ وُہ معصوم ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی غیر احمدی بچے کا بھی جنازہ نہیں پڑھا جا سکتا ہے[2]" اسی حکم کی تعمیل میں چودھری ظفر اللہ خاں صاحب نے (جو پاکستان کے وزیرِ خارجہ تھے) بانیٔ پاکستان مسٹر جناح کے جنازہ میں موجود ہونے کے باوجود شرکت نہیں کی۔

اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو عبادات و فرائض قادیانی سلسلہ میں داخل ہونے سے پہلے ادا کیے گئے ہیں وُہ باطل سمجھے جاتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان سے فرض ادا نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک استفسار کے جواب میں یہ لکھا گیا کہ "جس نے اس زمانہ میں حج فرض ادا کیا ہو کہ آپ (مرزا صاحب) کا دعویٰ

---

[1] الفضل جلد ۹، نمبر ۷ [2] الفضل قادیان جلد ۱۰، نمبر ۳۲

پوری طرح شائع ہو چکا اور ملک کے لوگوں پر عموماً اتمامِ حجت کر دیا گیا اور حضور (مرزا صاحب) نے غیر احمدی امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع فرمایا تو اس کا حج فرض ادا نہیں ہوا۔[۱]

عقیدۂ تناسخ و حلول مرزا صاحب کی بعض عبارتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ تناسخ و حلول کے بھی قائل تھے اور ان کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی روح اور حقیقت ایک دوسرے کے جسم میں ظہور کرتی رہی ہے۔ تریاق القلوب میں ہے:

"غرض جیسا کہ صوفیوں کے نزدیک مانا گیا ہے کہ مراتب وجود دوریہ ہیں۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنی خو اور طبیعت اور دلی مشابہت کے لحاظ سے قریباً اڑھائی ہزار برس اپنی وفات کے بعد پھر عبد اللہ پسر عبد المطلب کے گھر میں جنم لیا اور محمدؐ کے نام سے پکارا گیا۔"[۲]

ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں:

"اسی جگہ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانیت بھی اسلام کے اندرونی مفاسد کے غلبہ کے وقت ہمیشہ ظہور فرماتی رہتی ہے اور حقیقت محمدیہ کا حلول

---

[۱] اخبار الحکم قادیان ۷ مئی ۱۹۳۴ء
[۲] صفحہ ۱۵۵ حاشیہ

کسی کامل متبع میں جلوہ گر ہوتا ہے اور جو احادیث میں آیا ہے کہ مہدی پیدا ہوگا، اس کا نام میرا ہی نام ہوگا، اس کا خلق میرا ہی خلق ہوگا اگر یہ حدیثیں صحیح ہیں تو اسی نزولِ رُوحانیت کی طرف اشارہ ہے۔[1]

آئینہ کمالاتِ اسلام میں ایک دُوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"میرے پر کشفاً یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ زہرناک ہوا جو عیسائی قوم سے دُنیا میں پھیل گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ کو اس کی خبر دی گئی تب ان کی رُوح رُوحانی نزول کے لیے حرکت میں آئی اور اس نے جوش میں آکر اور اپنی اُمّت کو ہلاکت کا مفسدہ پرداز پاکر زمین میں اپنا قائم مقام اور شبیہ چاہا جو اس کا ایسا ہم طبع ہو، گویا وُہی ہو۔ سو اس کو خدائے تعالیٰ نے وعدہ کے مطابق ایک شبیہ عطا کی اور اس میں مسیح کی ہمت اور سیرت اور رُوحانیت نازل ہوئی اور اس میں اور مسیح میں بشدت اتصال کیا گیا۔ گویا وُہ ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے بنائے گئے اور مسیح کی توجہات نے اس کے دل کو اپنا قرارگاہ بنایا اور اس میں ہو کر اپنا تقاضا پورا کرنا چاہا۔ پس ان معنوں سے اس کا وجود مسیح کا وجود ٹھہرا اور مسیح کے پُرجوش ارادات اس میں نازل ہوئے جن کا نزول الہامی استعارات میں مسیح کا نزول قرار دیا گیا۔"[2]

---

[1] آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۴۶ [2] ایضاً ، صفحہ ۲۵۴، ۲۵۵

نبی کی دو بعثتیں

مرزا صاحب کا یہ بھی عقیدہ اور اعلان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بعثتیں تھیں۔ یہاں انھیں کے عربی متن و ترجمہ کی دو عبارتیں نقل کی جاتی ہیں:

اور جان کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ پانچویں ہزار میں مبعوث ہوئے، ایسا ہی مسیح موعود کی بروزی صورت اختیار کرکے چھٹیں ہزار کے آخر میں مبعوث ہوئے۔[1]	واعلم ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم کما بعث فی الالف الخامس کذلک بعث فی آخر الالف السادس باتخاذہ بروز المسیح الموعود،

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ بعثتِ ثانیہ بعثتِ اولیٰ سے کہیں زیادہ طاقتور، کامل اور روشن ہے:

بلکہ حق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت چھٹے ہزار کے آخر میں یعنی ان دنوں میں بہ نسبت ان سالوں کے اقوی اور اکمل اور اشد ہے بلکہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے۔[2]	بل الحق ان روحانیتہ علیہ السلام کان فی آخر الالف السادس اعنی فی ھذہ الایام اشد و اقوی و اکمل من تلک الاعوام بل کالبدر التام،

مرزا صاحب کا احساسِ برتری

نبوت اور کمالاتِ نبوت کے بارے میں مرزا صاحب کا احساسِ برتری جو ایک

---

[1] خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۸۰ [2] خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۸۱

خاص نفسیاتی کیفیت ہے۔ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ اوّل تو اپنے کو تمام انبیا کا ہم پلہ اور ہم چشم سمجھتے تھے۔ "نزول المسیح" میں فرماتے ہیں:

آنچہ داد است ہر نبی را جام
داد آں جام را مرا بہ تمام

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

انبیاء گرچہ بودہ اند بسے
من بہ عرفاں نہ کمترم ز کسے[1]

پھر اس سے آگے بڑھ کر وہ اپنے کو جامع کمالاتِ انبیاء سمجھتے ہیں۔ اسی کتاب میں فرماتے ہیں:

آدمم نیز احمدِ مختار
در برم جامۂ ہمہ ابرار[2]

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

زندہ شد ہر نبی بآمدنم،
ہر رسولے نہاں بہ پیرہنم[3]

اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا عقیدہ اور اعلان ہے کہ ان سے نسلِ آدم کی تکمیل ہوئی ہے اور ان کے بغیر یہ گلشنِ انسانیت ناتمام تھا، ان کا شعر ہے:

---

[1] صفحہ ۹۹ [2] صفحہ ۹۹ [3] صفحہ ۱۰۰

رہ گیا آدم کہ تھا وہ نا مکمل اب تلک
میرے آنے سے ہوا کامل بجملہ برگ و بار[1]

ان کا یہ خیال بھی معلوم ہوتا ہے کہ کمالاتِ نبوّت اور کمالاتِ رُوحانیت نے زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے اور اُن کا ظہورِ اتم اُن کی ذات میں ہوا ہے۔ خطبۂ الہامیہ میں وہ لکھتے ہیں:

فكذالك طلعت روحانية نبينا	اسی طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
صلى الله عليه وسلم في الالف الخامس	کی رُوحانیت نے پانچویں ہزار میں اجمالی صفات
بإجمال صفاتها وما كان ذالك الزمان	کے ساتھ ظہور فرمایا اور وہ زمانہ اس روحانیت
منتهى ترقياتها بل كانت قدما اولى	کی ترقیات کا منتہیٰ نہ تھا بلکہ اس کے کمالات
لمعارج كمالاتها ثم كملت وتجلت تلك	کے معراج کے لیے پہلا قدم تھا۔ پھر اس
الروحانية في آخر الالف السادس	روحانیت نے چھٹے ہزار کے آخر میں یعنی اس
اعني في هذا الحين كما خلق آدم في	وقت پُوری طرح سے تجلی فرمائی جیسا کہ آدم چھٹے
آخر اليوم السادس باذن الله احسن	دن کے آخر میں احسن الخالقین خدا کے
الخالقين واتخذت روحانية نبينا	اذن سے پیدا ہوا اور خیر الرسل کی
خير الرسل مظهرا من امته لتبلغ	روحانیت نے اپنے ظہور کے کمال کے لیے
كمال ظهورها وغلبة نورها كما كان	اور اپنے نور کے غلبہ کے لیے ایک مظہر

---

[1] براہین احمدیہ، حصہ پنجم، صفحہ ۱۱۳۔

وعد اللہ فی الکتاب المبین فأنا	اختیار کیا، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے کتاب مبین میں
ذالک المظہر الموعود و النور	وعدہ فرمایا تھا۔ پس میں وہی مظہر ہوں، وہی
المعہود۔[1]	نورِ معہود ہوں۔

اعجازِ احمدی میں تو انھوں نے اپنے معجزات وآیات کو معجزۂ نبوی پر ترجیح دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں :

له خسف القمر المنير وان لی
غسا القمران المشرقان اتنكر

اور خود ہی اس کا ترجمہ کیا ہے "اور اس کے لیے چاند کے خسوف کا نشان ظاہر ہوا اور میرے لیے چاند و سورج دونوں کا، اب کیا تو انکار کرے گا۔"[2]

مرزا صاحب کے یہ ارشادات اس بات کے لیے کافی تھے کہ ان کے غالی عقیدتمند اور اُن کے جانشین اس پر ایک بلند عمارت تعمیر کرلیں۔ جیسا کہ فرق و مذاہب کی تاریخ میں ہمیشہ پیش آیا ہے۔ چنانچہ اُن کے بہت سے متبعین اُن کو اکثر انبیاء پر صراحت کے ساتھ فضیلت دینے لگے۔ خود مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے حقیقۃ النبوت میں لکھا ہے :

"دنیا میں بہت سے نبی گزرے ہیں مگر اُن کے شاگرد محدثیت کے درجہ سے آگے نہیں بڑھے سوائے ہمارے نبی علیہ السلام کے جو

---

[1] خطبۂ الہامیہ صفحہ ۱۷۷، ۱۷۸۔ [2] اعجازِ احمدی صفحہ ۷۱

اس کے فیضان نے اس قدر وسعت اختیار کی کہ اس کے شاگردوں میں سے علاوہ بہت سے محدثوں کے ایک نے نبوت کا بھی درجہ پایا۔ اور نہ صرف یہ کہ نبی بنا بلکہ اپنے مطاع کے کمالات کو ظلی طور پر حاصل کر کے بعض اولوالعزم نبیوں سے بھی آگے نکل گیا۔"[۱]

مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے پُرجوش متبعین نے اس بات کو اور بھی آگے بڑھا دیا۔ الفضل قادیان (جلد ۱۴، نمبر ۸۵) میں ہے:

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام نبی تھے۔ آپ کا درجہ مقام کے لحاظ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شاگرد اور آپ کا ظل ہونے کا تھا۔ دیگر انبیاء علیہم السلام میں سے بعضوں سے آپ بڑے تھے۔ ممکن ہے سب سے بڑے ہوں۔"[۲]

---

[۱] حقیقۃ النبوۃ، صفحہ ۲۵۷ [۲] مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۲۷ء (ماخوذ از قادیانی مذہب)

باب سوم

مرزا صاحب کی سیرت و زندگی پر
ایک نظر

فصل اوّل

دعوت کے فروغ اور رجوعِ عام کے بعد مرزا صاحب کی زندگی

مرزا صاحب کا ابتدائی زمانہ

مرزا غلام احمد صاحب نے اپنی زندگی عسرت و غربت کے ساتھ شروع کی تھی۔ زمینداری کا بڑا حصہ نکل چکا تھا۔ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ وہ خود اس دور کے متعلق لکھتے ہیں:

"مجھے صرف اپنے دستر خوان اور روٹی کی فکر تھی"[۱]

وہ پچیس برس سے گمنامی اور غربت کی زندگی گزار رہے تھے۔ انھوں نے اس زمانہ کی غربت و گمنامی کی خود تصویر کھینچی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"اس زمانہ میں درحقیقت میں اس مردہ کی طرح تھا جو قبر میں صدہا سال سے مدفون ہو اور کوئی نہ جانتا ہو یہ کس کی قبر ہے؟"[۲]

یہ حالت اس وقت تک رہی کہ مرزا صاحب ایک مصنف اور اسلام کے وکیل کی حیثیت سے ملک کے سامنے آئے۔ پھر انھوں نے ایک مبلغ اور روحانی پیشوا

---

[۱] نزول المسیح طبع اوّل صفحہ ۱۱۸ [۲] تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۸

کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ پھر انھوں نے مسیح موعود، اور آخر میں مستقل پیغمبر کی حیثیت اختیار کی۔ اس وقت حالات میں بڑا انقلاب ہوا۔ اب وہ ایک ترقی پذیر فرقہ اور ایک آسودہ حال طبقہ کے رُوحانی پیشوا اور معتقدانِ اعظم تھے۔ ہر طرف سے تحائف، نذروں اور پیشکشوں کا دریا اُمنڈ رہا تھا اور وہ ہزاروں آدمیوں کی رُوحانی عقیدت اور خلوص و محبت کا مرکز تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری دولت، فارغ البالی و خوش حالی ایک دینی دعوت اور تحریک کے راستہ سے آئی تھی اور ایک دینی جذبہ ہی لوگوں کے ایثار اور مرزا صاحب کی مالی خدمت کا محرک تھا۔ ایک مورخ اور سوانح نگار اور ایک نقاد اس موقع پر یہ دیکھے گا کہ اس انقلابِ حال نے مرزا صاحب کی زندگی اور اُن کے رویّہ میں کیا تبدیلی پیدا کی۔ مرزا صاحب ایک بڑی دینی دعوت لے کر اور ایک بہت بڑے دعوے اور اعلان کے ساتھ (جس سے بڑا دعویٰ اور اعلان مذہب کی اصطلاحات اور زبان میں ممکن نہیں۔) کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ اُن کی زندگی کو اس دعوت اور دعوے سے کیا مطابقت اور مناسبت ہے؟ سرورِ عالم سیدالانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیاتِ طیبہ سے موازنہ کرنا اور اس سلسلہ میں آپ کا نامِ نامی بیچ میں لانا تو سوءِ ادب اور مذاقِ سلیم پر بھی بار ہے کہ یہ وہ بارگاہِ قدس ہے کہ

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

لیکن اُمتِ محمدی کے اُن افراد کی زندگی سے موازنہ بیجا نہ ہوگا جو کسی دینی

تحریک و دعوت کے علمبردار اور اپنے زمانہ کے مقتدا اور روحانی پیشوا تھے۔

حاملینِ دعوت اور دینی و روحانی شخصیتوں کا طرزِ عمل

اسلام کی تاریخ دعوت و تجدید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے زمانہ میں دینی دعوت و اصلاح کے علمبردار تھے اور جنھوں نے اپنے لیے اتباعِ نبوی کا راستہ انتخاب کیا اور جن کو خدا نے حلاوتِ ایمانی سے شاد کام کیا، ان کو جس قدر مرجعیت حاصل ہوتی اور جس قدر اُن کے لیے فارغ البالی اور آسودہ زندگی کے اسباب مُہیّا ہوتے اسی قدر اُن میں زہد کا جذبہ، ایثار و قناعت کا جوش، دولت و امارت سے وحشت اور آخرت کا شوق بڑھتا۔ اُن کی ساری زندگی اس اصول و یقین کے ماتحت تھی کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے، اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃ، دینی اور روحانی شخصیتوں کی تاریخ میں ہر جگہ یہی نظر آتا ہے کہ وہ اس دنیا میں مسافرانہ گزر کرتے تھے۔ اور اُن کے سامنے ہمیشہ یہ ارشادِ نبوی رہتا تھا۔

مالی و للدنیا وما انا و الدنیا الا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح و ترکھا	مجھے دنیا سے کیا سروکار؟ میری مثال تو ایسے سوار کی سی ہے جس نے کچھ دیر ایک درخت کے سایہ میں آرام لیا۔ پھر اٹھا اور چھوڑ کر چل دیا۔
(احمد، ترمذی، ابن ماجہ)	

اُن کی کیفیت وہ رہتی تھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک رفیق نے اُن کی تعریف کرتے

ہوئے بیان کی ہے :

يَسْتَوْحِشُ مِنَ الدُّنْيَا وَزَهْرَتِهَا	دُنیا اور بہارِ دُنیا سے ان کو وحشت
وَيَسْتَأْنِسُ بِاللَّيْلِ وَظُلْمَتِهِ كَانَ	ہوتی، رات کی تاریکی میں اُن کا دل لگتا تھا،
وَاللهِ غَزِيْرَ الدَّمْعَةِ طَوِيْلَ الْفِكْرَةِ	آنکھیں پُرآب، ہر وقت فکر و غم میں
يُقَلِّبُ كَفَّهُ وَيُخَاطِبُ نَفْسَهُ يُعْجِبُهُ	ڈوبے ہوئے۔ رفتارِ زمانہ پر متعجب نفس
مِنَ اللِّبَاسِ مَا خَشُنَ، وَمِنَ	سے ہر وقت مخاطب کپڑا وہ مرغوب جو معمولی
الطَّعَامِ مَا جَشُبَ	اور موٹا جھوٹا ہو۔ غذا وہ مرغوب جو غریبانہ
(صِفَةُ الصَّفْوَةِ)	اور سادہ ہو۔

اولیائے متقدمین اور اسلام کی جلیل القدر رُوحانی شخصیتوں کا یہاں ذکر نہیں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا بھی یہاں تذکرہ نہیں کہ وُہ بھی ایک خلیفۂ راشد تھے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں ایسے صاحب شوکت و عظمت سلاطین گزرے ہیں جن کا زہد و تقشف، جفاکشی، احتیاط و ورع، قبائے شاہی میں فقیری و درویشی اور تختِ سلطنت پر بوریہ نشینی آج بھی تاریخ میں یادگار اور انسانیت کے لیے سرمایۂ افتخار رہے گی۔ نورالدین زنگیؒ، صلاح الدین ایوبیؒ[1]، ناصر الدین محمودؒ، مظفر حلیمؒ اور سلطان

---

[1] سلطان کے سوانح نگار اور اُن کے معتمدِ خاص قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ "سلطان نے اپنے ترکہ میں صرف ۴۷ درہم چھوڑے تھے۔ کوئی جائداد، مکان یا جائداد، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز و تکفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے صرف نہیں ہوا۔ سارا سامان قرض سے کیا گیا۔ یہاں تک کہ قبر کے لیے گھاس کے پولے بھی قرض سے آئے۔ کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا۔" اور یہ اس سلطان کا حال ہے جس کے قبضہ میں شام، مصر، سوڈان، عراق و حجاز اور مشرق وسطیٰ کا پورا علاقہ تھا۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ نے جس طرح کی زندگی گزار دی۔ وہ زہد و درویشی کا اعلیٰ نمونہ ہے خود مرزا صاحب کے زمانہ میں ایسے داعی الی اللہ علمائے ربانی اور مشائخ طریقت موجود تھے جو روپیہ پر رات گزارنے کو گناہ سمجھتے تھے اور جو کچھ اُن کے پاس آتا تھا وُہ فقراء اور اہلِ حاجت میں تقسیم کر دیتے تھے جن کا حال یہ تھا کہ جس قدر آسُودگی کے اسباب زیادہ ہوتے تھے اور جس قدر لوگوں کا رجوع اُن کی طرف بڑھتا تھا، جس قدر تحائف و ہدایا کی بارش ہوتی تھی اسی قدر اُن کا استغنا اور زہد ترقی کرتا تھا۔ مرزا صاحب ہی کے زمانے میں مولانا فضل الرحمٰن گنج مُرادآبادیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا سیّد عبداللہ غزنویؒ، مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ جیسے حضرات موجود تھے جنھوں نے فقرِ محمّدی کا ایک نمونہ دُنیا کے سامنے پیش کیا۔[1]

صدقِ نبوّت کی ایک دلیل

ایسی زاہدانہ زندگی جس میں اوّل سے آخر تک کوئی تفاوت نہ ہو۔ غربت و امارت کے زمانہ میں یکساں طرزِ عمل اور دولتِ دُنیا سے بے تعلقی و بے اثری خود مرزا صاحب کے نزدیک نبوتِ محمّدیؐ کی صداقت کی ایک دلیل ہے۔ وُہ لکھتے ہیں:

"اور پھر جب مدتِ مدید کے بعد غلبہ اسلام کا ہُوا۔ تو ان دولت و اقبال کے دنوں میں کوئی خزانہ اکٹھا نہ کیا۔ کوئی عمارت نہ بنائی کوئی یادگار تیار نہ ہوئی۔ کوئی سامانِ شاہانہ عیش و عشرت تجویز نہ کیا گیا"

---

[1] حالات کے لیے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر جلد ہشتم

کوئی اور ذاتی نفع نہ اٹھایا بلکہ جو کچھ آیا وہ سب یتیموں اور مسکینوں اور بیوہ عورتوں اور مفرد صنوں کی خبر گیری میں خرچ ہوتا رہا اور کبھی ایک وقت بھی سیر ہو کر نہ کھایا۔"[۱]

دین کا داعی یا سیاسی قائد؟

اب ہم اس معیار کو سامنے رکھ کر جو خود مرزا صاحب نے ہم کو دیا ہے اور جو مزاج نبوت کے عین مطابق ہے۔ ہم خود مرزا صاحب کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم کو اس مطالعہ میں نظر آتا ہے کہ جب ان کی تحریک پھیل گئی اور وہ ایک بڑے فرقہ کے روحانی پیشوا اور اس کی عقیدتوں اور فیاضانہ اولو العزمیوں کا مرکز بن گئے تو ان کی ابتدائی اور اس آخری زندگی میں بڑا فرق نمایاں ہوا۔ ہمیں اس موقع پر ان کے حالات، دین کے داعیوں اور مبلغوں اور درسگاہِ نبوت کے فیض یافتہ نفوس قدسیہ سے الگ سیاسی قائدین اور غیر دینی تحریکوں کے بانیوں سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں اور ان کی آخری زندگی میں (جو سفر آخرت اور لقاء الٰہی کا زمانہ ہے) ترفہ اور عیش و تنعم کے وہ مناظر نظر آتے ہیں جو عام طور پر سیاسی رہنماؤں کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ چیز ان کے مخلص و مقرب ساتھیوں کے لیے بھی اضطراب کا باعث ہوئی اور دل کی بات زبانوں پر آنے لگی۔

مرزا صاحب کی خانگی زندگی

مرزا صاحب کی خانگی زندگی جس ترفہ اور جیسے تجمل اور تنعم کی تھی وہ راسخ الاعتقاد متبعین کے

---

[۱] سیرۃ المہدی، حصہ اول صفحہ ۷۰۔

لیے بھی ایک شبہ اور اعتراض کا موجب بن گئی تھی۔ خواجہ کمال الدین صاحب نے ایک روز اپنے مخصوص دوستوں کے سامنے اس بات کا تذکرہ کیا کہ اُن کے گھر کی جو بیبیاں مرزا صاحب کے گھر کی رہائش اور معیارِ زندگی دیکھ چکی ہیں، وہ کسی طرح سے ایثار و قناعت اور سلسلہ کی اشاعت و ترقی کے لیے اپنی ضرورتوں سے پس انداز کر کے روپیہ بھیجنے کے لیے تیار نہیں۔ انھوں نے ایک مرتبہ مولوی محمد علی صاحب (امیر جماعت احمدیہ لاہور) اور قادیانی جماعت کے مشہور عالم مولوی سرور شاہ صاحب قادیانی سے کہا:

"میرا ایک سوال ہے جس کا جواب مجھے نہیں آتا۔ میں اسے پیش کرتا ہوں۔ آپ اس کا جواب دیں۔ پہلے ہم اپنی عورتوں کو یہ کہہ کر کہ انبیاء و صحابہ والی زندگی اختیار کرنی چاہیے کہ وہ کم و خشک کھاتے اور خشن پہنتے تھے اور باقی بچا کر اللہ کی راہ میں دیا کرتے تھے۔ اسی طرح ہم کو بھی کرنا چاہیے۔ غرض ایسے وعظ کر کے کچھ روپیہ بچاتے تھے اور پھر وہ قادیان بھیجتے تھے لیکن جب ہماری بیبیاں خود قادیان گئیں۔ وہاں پر رہ کر اچھی طرح وہاں کا حال معلوم کیا تو واپس آ کر ہمارے سر پر چڑھ گئیں کہ تم تو بڑے جھوٹے ہو۔ ہم نے تو قادیان میں جا کر خود انبیاء و صحابہ کی زندگی کو دیکھ لیا ہے۔ جس قدر آرام کی زندگی اور تعیش وہاں پر عورتوں کو حاصل ہے اس کا عشرِ عشیر بھی باہر نہیں۔ حالانکہ ہمارا روپیہ کمایا ہوا ہوتا

ہے اور اُن کے پاس جو روپیہ جاتا ہے وہ قومی اغراض کے لیے قومی روپیہ ہوتا ہے۔ لہٰذا تم جھوٹے ہو، جو جھوٹ بول کر اس عرصۂ دراز تک ہم کو دھوکا دیتے رہے اور آیندہ ہم ہرگز تمہارے دھوکے میں نہ آویں گی۔ پس وہ اب ہم کو روپیہ نہیں دیتیں کہ ہم قادیان بھیجیں"۔

خواجہ صاحب نے یہ بھی فرمایا:

"ایک جواب تم لوگوں کو دیا کرتے ہو پھر تمہارا وہ جواب میرے آگے نہیں چل سکتا کیونکہ میں خود واقف ہوں"[1]۔

اور پھر بعض زیورات اور بعض کپڑوں کی خرید کا مفصل ذکر کیا۔

مالی اعتراضات معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے زمانہ میں اُن کی نگرانی میں لنگر کا جو انتظام تھا اس سے بہت سے معترضین مطمئن نہیں تھے۔ اُن کے نزدیک اس میں بہت سی بے عنوانیاں ہوتی تھیں۔ اس بحث نے بہت طول کھینچا۔ معترضین میں خواجہ کمال الدین پیش پیش تھے اور مولوی محمد علی صاحب بھی اُن کے مؤید تھے۔ خواجہ کمال الدین صاحب نے ایک موقع پر مولوی محمد علی صاحب سے فرمایا:

"یہ کیسے غضب کی بات ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ قوم کا روپیہ کس محنت سے جمع ہوتا ہے اور جن اغراض قومی کے لیے وہ اپنا پیٹ کاٹ کر روپیہ دیتے ہیں۔ وہ روپیہ ان اغراض میں صرف نہیں ہوتا بلکہ

---

[1] کشف الاختلاف از سرور شاہ قادیانی صفحہ ۱۳ (ماخوذ از قادیانی مذہب)

بجائے اس کے شخصی خواہشات میں صرف ہوتا ہے اور پھر وہ روپیہ بھی اس قدر کثیر ہے کہ اس وقت جس قدر قومی کام آپ نے شروع کیے ہوئے ہیں اور روپیہ کی کمی کی وجہ سے پورے نہیں ہو سکے اور ناقص حالت میں پڑے ہوئے ہیں اگر یہ لنگر کا روپیہ اچھی طرح سے سنبھالا جاتا تو اکیلے اسی سے وہ سارے کام پورے ہو سکتے ہیں[1]۔"

یہ اعتراضات مرزا صاحب کے کان تک بھی پہونچے، اور انھوں نے اس پر بڑی ناگواری و ناراضگی کا اظہار کیا۔ مولوی سرور شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"مجھے پختہ ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بہت اظہار رنج فرمایا ہے کہ باوجود میرے بتلانے کے کہ خدا کا منشا یہی ہے کہ میرے وقت میں لنگر کا انتظام میرے ہی ہاتھ میں رہے اور اگر اس کے خلاف ہوا تو لنگر بند ہو جائے گا مگر یہ خواجہ وغیرہ ایسے ہیں کہ بار بار مجھے کہتے ہیں کہ لنگر کا انتظام ہمارے سپرد کر دو اور مجھ پر بدظنی کرتے ہیں[2]۔"

خود مرزا صاحب نے اپنے انتقال سے کچھ پہلے اس مالی الزام کا تذکرہ اور اس پر اپنے رنج و ملال کا اظہار کیا۔ مرزا بشیر الدین صاحب مولوی حکیم نورالدین صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

---

[1] کشف الاختلاف، صفحہ ۱۵ [2] ایضاً، صفحہ ۱۴

"حضرت صاحب نے اپنی وفات سے پہلے جس دن وفات ہوئی۔ اسی دن بیماری سے کچھ ہی پہلے کہا کہ خواجہ (کمال الدین) صاحب اور مولوی محمد علی صاحب وغیرہ مجھ پر بدظنی کرتے ہیں کہ میں قوم کا روپیہ کھا جاتا ہوں۔ ان کو ایسا نہ کرنا چاہیے تھا ورنہ انجام اچھا نہ ہوگا، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ آج خواجہ صاحب مولوی محمد علی صاحب کا ایک خط لے کر آئے اور کہا کہ مولوی محمد علی نے لکھا ہے کہ لنگر کا خرچ تو تھوڑا سا ہوتا ہے۔ باقی ہزاروں روپیہ جو آتا ہے۔ وہ کہاں جاتا ہے اور گھر میں آکر آپ نے بہت غصہ ظاہر کیا، کہا یہ لوگ ہم کو حرام خور سمجھتے ہیں۔ ان کو اس روپیہ سے کیا تعلق! اگر آج میں الگ ہو جاؤں تو سب آمدن بند ہو جائے۔

پھر خواجہ صاحب نے ایک ڈیپوٹیشن کے موقع پر جو عمارت مدرسہ کا چندہ لینے گیا تھا۔ مولوی محمد علی سے کہا کہ حضرت (مرزا) صاحب آپ تو خوب عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں، اور ہمیں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ اپنے خرچ گھٹا کر بھی چندہ دو، جس کا جواب مولوی محمد علی نے یہ دیا کہ ہاں اس کا انکار تو نہیں ہو سکتا لیکن بشریت ہے، کیا ضرور کہ ہم نبی کی بشریت کی پیروی کریں۔"[1]

---

[1] مرزا بشیر الدین محمود صاحب کا خط بنام مولوی حکیم نور الدین صاحب خلیفہ اول مندرجہ حقیقت الاختلاف مصنفہ مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور صفحہ ۵۰۔ ہم نے مالی اعتراضات کے سلسلے میں صرف مشہور و معتمد اہلِ تعلق کے بیانات پر اکتفا کیا ہے۔ ورنہ ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب کی کتاب الذکر الحکیم وغیرہ میں اس سلسلہ کا بہت مواد موجود ہے۔

آمدنی کے نئے نئے ذرائع

مرزا صاحب ہی کی زندگی میں قادیان کے "بہشتی مقبرہ" میں جگہ پانے کے لیے جو شرائط وضع کی گئیں اور ایک قبر کی جگہ کے لیے جو گراں قدر قیمت مقرر کی گئی اور اس کا جس ترغیب و تشویق کے ساتھ اعلان کیا گیا[1]۔ اس نے قرونِ وسطیٰ کے اربابِ کلیسا کے "پروانۂ غفران" کے بیع و شرا اور جنت کی قبالہ فروشی کی یاد تازہ کر دی اور مرکز قادیان کے لیے آمدنی کا ایک وسیع و مستقل سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ رفتہ رفتہ سلسلۂ قادیانیت کا ایک عظیم محکمہ بن گیا۔ قادیان کے ترجمان "الفضل" نے اپنی ایک اشاعت میں صحیح لکھا ہے کہ

"مقبرہ بہشتی اس سلسلہ کا ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے اور ایسا عظیم الشان انسٹی ٹیوشن یعنی محکمہ ہے جس کی اہمیت ہر دوسرے محکمہ سے بڑھ کر ہے۔"[2]

قادیان اور ربوہ کی دینی ریاست

اس سارے آغاز کا انجام یہ ہوا کہ تحریک قادیانیت کا مرکز قادیان اور تقسیم ہند کے بعد سے اس کا جانشین ربوہ ایک اہم دینی ریاست بن گیا۔ جس میں قادیان کے "خاندانِ نبوت" اور اس کے صدر نشین مرزا بشیر الدین محمود کو امارت و ریاست کے وہ سب لوازم، ایک مذہبی آمر اور مطلق العنان فرماں روا کے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مرزا صاحب کا رسالہ "الوصیت" صفحہ ۱۱ تا ۲۳۔ [2] "الفضل" قادیان جلد ۲۲، نمبر ۶۵، صفحہ ۵، ستمبر ۱۹۳۲ء۔

سب اختیارات اور خوش باشی و عیش کوشی کے وہ سب مواقع مہیا ہیں، جو اس زمانہ میں کسی بڑے سے بڑے انسان کو مہیا ہو سکتے ہیں۔ اس "دینی و روحانی مرکز" کی اندرونی زندگی اور اس کے امیر کی اخلاقی حالت حسن بن صبّاح باطنی کے قلعۃ الموت کی یاد تازہ کرتی ہے جو پانچویں صدی ہجری میں مذہبی استبداد اور عیش و عشرت کا ایک پُراسرار مرکز تھا۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو راحت ملک صاحب کی کتاب "دورِ حاضر کا مذہبی آمر"

فصل دوم

انگریزی حکومت کی تائید و حمایت اور جہاد کی ممانعت

برطانیہ عظمیٰ اور عالمِ اسلام

انیسویں صدی کے آغاز میں عالم اسلام پر یورپ کے حملے شروع ہو چکے تھے اور اس نے ممالک اسلامیہ کو اپنے اثر و اقتدار میں لے لیا تھا۔ یورپ کی اس مشرقی ترکتاز میں برطانیہ عظمیٰ پیش پیش اور مشرق میں مغربی پیش قدمیوں اور سیاسی و مادی سیادت کا علمبردار و نقیب تھا۔ ہندوستان اور مصر اس کے زیر اقتدار تھے۔ دولت عثمانیہ اس کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا ہدف اور جزیرۃ العرب اس کی ہوسِ اقتدار سے ہر وقت خطرہ میں تھا۔

ہندوستان پر ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی عملاً انگریزی تسلط قائم ہو چکا تھا۔ شاہجہاںؒ اورنگ زیب کے جانشین انگریزوں کے وظیفہ خوار اور سیاسی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ انگریز ملک کی بساطِ سیاست کے اصل شاطر اور سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ سنہ ۱۷۹۹ء میں ہندوستان کے مردِ مجاہد سلطان ٹیپوؒ نے میدان کارزار

میں شہادت سے سرخروئی حاصل کی اور انگریزوں کے حق میں مُلک کا سیاسی مطلع بالکل صاف ہو گیا۔ سلطنت کے استحکام پر اعتماد کر کے پادریوں نے مسیحیت کی صاف صاف تبلیغ شروع کی۔ اس تبلیغ کا نشانہ قدرتی طور پر زیادہ تر مسلمان بنے جن سے براہِ راست مُلک حاصل کیا گیا تھا۔ تعلیماتِ اسلام اور اصُولِ اسلام کا مضحکہ اُڑایا جانے لگا۔ مُلک میں اخلاقی و اجتماعی انتشار و بدنظمی کا دور دورہ ہُوا۔ اسلام کی اجتماعی زندگی کی بنیادیں تزلزل میں آگئیں۔ مغربی تہذیب نے مسلمانوں کے گھروں اور ان کے دل و دماغ پر چھاپہ مارا۔ نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ میں الحاد فیشن کے طور پر شروع ہوا۔

اس سب کے ردِّعمل میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ظہور میں آیا، جس میں عَلَمِ قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا جیسا سب کو معلوم ہے۔ انگریز اس معرکہ میں کامیاب ہوئے اور یہ مُلک ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظام سے نکل کر براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ماتحت ہو گیا۔ زخم خوردہ فاتحین نے ہنگامہ کے اصل ذمّہ دار باغی مسلمانوں سے سخت انتقام لیا۔ اُنھوں نے ان کو بے عزّت کیا۔ ان کے عُلَماَ و صُلَحاَ اور رُؤسا و شرفا کو پھانسیوں پر چڑھایا۔ اسلامی اوقاف ضبط کر لیے۔ شریفانہ ملازمت کے دروازے اُن پر بند کر دیے۔ مُلک کے نظم و نسق سے اُن کو قطعۃً بے دخل کر دیا۔[۱]

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر کی کتاب On Indian Musalmans اور سر سیّد کی "اسبابِ بغاوتِ ہند"۔

وہ ایک شکست خوردہ قوم کے ذلیل افراد بن کر رہ گئے اور اس ملک میں قرآن کی اس ابدی حقیقت کی تفسیر و تصویر نظر آئی :

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً	بے شک بادشاہ و فاتح جب کسی بستی میں
اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ	(فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور
اَذِلَّةً ۚ (النمل)	اس کے معزز ترین شہریوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں۔

انگریز اس ملک میں محض ناخدا ترس فرمانروا اور جابر حاکم نہ تھے بلکہ وہ ایک ایسی تہذیب کے بھی علمبردار تھے جو اس ملک میں فساد و الحاد اور اخلاقی انتشار کا سرچشمہ تھی۔ وہ عملاً ان تمام اقدارِ حیات کے منکر اور ان اخلاقی و دینی معیاروں سے منحرف تھے جن پر اسلام کے اخلاقی و اجتماعی نظام کی بنیاد ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ قوم تھے جس کی تاریخ عالم اسلام پر مظالم اور سیاسی جرائم سے داغ داغ ہے۔

انبیاء اور ان کے جانشینوں کا طرزِ عمل

انبیاء علیہم السلام اور ان کے جانشینوں اور پیروؤں کی جو کچھ تاریخ اور سیرت دنیا میں محفوظ ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ظالموں اور مجرموں کے حریف اور مدِ مقابل رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ ہر ایسی بات سے احتراز کیا ہے جس سے ان کی تائید اور امداد ہوتی ہو۔ حضرت موسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ مقولہ قرآن مجید میں منقول ہے :

رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ	اے رب جیسا تو نے مجھ پر فضل کیا پھر میں

أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ (القصص) — کبھی گنہگاروں اور مجرموں کا مددگار نہ ہوں گا۔

کفر و ظلم اور اس کے علمبرداروں کے خلاف ان کے دل میں جو جذبہ اور غصہ تھا، اس کا اظہار ان کی اس مشہور دعا سے ہوتا ہے جو انھوں نے فرعونِ وقت اور اس کے ارکانِ سلطنت کے خلاف کی تھی۔

رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ	اے رب ہمارے تو نے فرعون کو اور اس کے
وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي	سرداروں کو دُنیا کی زندگی میں رونق اور مال دیئے
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ	جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ تیرے راستے سے بھٹکائیں
سَبِيلِكَ ۖ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ	گے اے رب ان کی دولت پر جھاڑو پھیر دے
أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ	اور ان کے دل سخت کر دے کہ جب تک
فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ	دردناک عذاب نہ دیکھ لیں، ایمان نہ
الْأَلِيمَ ۝	لائیں۔

خود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا:

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ	اور مت جھکو اُن کی طرف جو ظالم ہیں پھر
ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم	تم کو لگے گی آگ اور اللہ کے سوا تمھارا کوئی
مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ	مددگار نہ ہوگا، پھر کہیں مدد نہ پاؤ گے
لَا تُنصَرُونَ ۝	(سورۂ ہود، رکوع ۱۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

اَفْضَلُ الْجِهَادِ کَلِمَۃُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ
جہاد کی اعلیٰ ترین قسم ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اُن کے سچے جانشینوں نے کسی جابر حکومت اور کسی باطل طاقت کے ساتھ کبھی تعاون نہیں کیا اور ان کی زبان کبھی اس کی تعریف و تائید سے ملوث نہیں ہوئی۔ اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت سلاطینِ وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے واقعات اور ظالموں کے مقابلے میں عَلَمِ جہاد بلند کرنے کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔ اس افضل جہاد سے تاریخ اسلام کا کوئی مختصر سے مختصر عہد اور کوئی چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی خالی نہیں ہے۔

انگریزی حکومت کی تائید وحمایت اور جہاد کی حرمت

لیکن قرآن مجید کی ان روشن تعلیمات اور روح اسلام کے بالکل برخلاف اور انبیاءؑ و مرسلین، صحابہ و تابعین اور ان کے متبعین کے اسوۂ حسنہ کے برعکس مرزا غلام احمد صاحب جن کو مامور من اللہ اور مرسل من عند اللہ ہونے کا دعویٰ ہے، اپنے عہد کے طاغوتِ اکبر انگریز کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ وہ اسی حکومت کی تائید وحمایت میں سرگرم نظر آتے ہیں جو اسلامی مملکت کی غاصب اور اسلامی اقتدار کی سب سے بڑی حریف اور اپنے زمانے میں فساد و الحاد کی سب سے بڑی علمبردار تھی۔ وہ ایسے کھلے لفظوں میں اس حکومت کی مدح وثنا کرتے ہیں جس کے لیے ایک صاحب ضمیر انسان تیار نہیں ہو سکتا۔ ان کو شروع سے اس مسئلے کا اتنا اہتمام تھا کہ ان کی کوئی تصنیف مشکل

سے اس سے خالی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی پہلی اور سب سے اہم تصنیف "براہین احمدیہ" کے حصۂ اول میں جس طرح اس حکومت کی تعریف و توصیف کی ہے اور اس کے احسانات و خدمات گنائے ہیں اور جس طرح اسلامی انجمنوں کو مسلمانوں کی طرف سے وفاداری کا محضر پیش کرنے اور جہاد کو منسوخ و ممنوع قرار دینے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔ یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک وسیع کتب خانہ تیار کر دیا۔ جس میں انھوں نے بار بار اپنی وفاداری اور اخلاص اور اپنی خاندانی خدمات اور انگریزی حکومت کی تائید و حمایت میں اپنی سرگرمی اور انہماک کا ذکر کیا ہے اور ایک ایسے زمانے میں جب مسلمانوں میں دینی حمیت کو بیدار کرنے کی سخت ضرورت تھی، بار بار جہاد کے حرام و ممنوع ہونے کا اعلان کیا۔ یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف چند عبارتیں اور اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔
ایک جگہ لکھتے ہیں :

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید و حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ اگر وہ اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل

معاندین اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں۔ ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔"[1]

اپنی کتاب شہادت القرآن کے آخر میں لکھتے ہیں :

"میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں، یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں، ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرے، دوسرے اس سلطنت کی کہ جس نے امن قائم کیا ہو جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایے میں پناہ دی ہو، سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے۔"[2]

ایک درخواست میں جو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء کو پیش کی گئی تھی، لکھتے ہیں :

"دوسرا امر قابل گذارش یہ ہے کہ میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں کہ تا مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کروں جو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں ....

.... اور میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے دلوں پر میری تحریروں کا بہت

---

[1] تریاق القلوب صفحہ ۱۵   [2] اشتہار گورنمنٹ کی توجہ کے لائق صفحہ ۳ کتاب شہادۃ القرآن کے آخر میں

ہی اثر ہوا اور لاکھوں انسانوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔[۱]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"میں نے بیسیوں کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں اس غرض سے تالیف کی ہیں کہ اس گورنمنٹ محسنہ سے ہرگز جہاد درست نہیں بلکہ سچے دل سے اطاعت کرنا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے چنانچہ میں نے یہ کتابیں بصرفِ زرِ کثیر چھاپ کر بلادِ اسلام میں پہنچائیں اور میں جانتا ہوں کہ ان کتابوں کا بہت سا اثر اس ملک پر بھی پڑا ہے اور جو لوگ میرے ساتھ مریدی کا تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسی جماعت تیار ہوتی جاتی ہے کہ جن کے دل اس گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی سے لبالب ہیں۔ ان کی اخلاقی حالت اعلیٰ درجہ پر ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ وہ تمام اس ملک کے لیے بڑی برکت ہیں اور گورنمنٹ کے لیے دلی جان نثار ہیں۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک اور نیز دوسرے بلادِ اسلام میں اس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے۔ لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے

---

۱ تبلیغ رسالت جلد ہفتم صفحہ ۱۰ ۔ ۲ عریضہ بعالی خدمت گورنمنٹ عالیہ انگریزی من جانب مرزا غلام احمد قادیانی صاحب مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ششم صفحہ ۶۵۔ مرتبہ میر قاسم علی صاحب قادیانی۔

کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اور دل سے اس دولت کا شکرگزار اور دعاگو رہے اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اردو، فارسی، عربی میں تالیف کرکے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں۔ یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں مکے اور مدینے میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ اور بلاد شام اور مصر اور کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا اشاعت کر دی گئی۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہیں سکتا۔"[1]

مرزا صاحب کی خصوصی توجہ مسئلہ جہاد پر مرکوز تھی جو انگریزی حکومت کے لیے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں (جن کا بڑا حصہ برطانیہ کے زیر اقتدار آ چکا تھا) خاص تشویش اور اضطراب کا باعث تھا۔ مرزا صاحب نے جہاد کے دائمی طور پر منسوخ اور ممنوع ہو جانے کا اعلان فرمایا اور اس کو اپنے مسیح موعود ہونے کا نشان قرار دیا۔ چندہ منارۃ المسیح کے اعلان میں فرماتے ہیں:

---

[1] ستارہ قیصرہ صفحہ ۳۔

"تیسرے وُہ گھنٹہ جو اس منارہ کے کسی حصّہ دیوار میں نصب کرایا جائے گا۔ اس کے نیچے یہ حقیقت مخفی ہے کہ تا لوگ اپنے وقت کو پہچان لیں یعنی سمجھ لیں کر آسمان کے دروازوں کے کھلنے کا وقت آگیا۔ اب سے زمینی جہاد بند کیے گئے اور لڑائیوں کا خاتمہ ہو گیا، جیسا کہ حدیثوں میں پہلے لکھا گیا تھا کہ جب مسیح آئے گا تو دین کے لیے لڑنا حرام کیا جائے گا سو آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھا کر کافروں کو قتل کرتا ہے وُہ خدا اور اُس کے رسُول کا نافرمان ہے۔ صحیح بُخاری کو کھولو اور اس حدیث کو پڑھو جو مسیح موعود کے حق میں ہے، یعنی یضع الحرب جس کے یہ معنی ہیں کہ جب مسیح آئے گا تو جہادی لڑائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سو مسیح آچکا اور یہی ہے جو تم سے بول رہا ہے۔"[1]

جہاد کے اس موقوف ہونے کو وُہ اپنی "بعثت" کا مقصدِ اعظم قرار دیتے ہیں۔ تریاق القلوب کے ضمیمہ "اشتہار واجب الاظہار" میں لکھتے ہیں:

"غرض میں اس لیے ظاہر نہیں ہُوا کہ جنگ وجدل کا میدان گرم کروں بلکہ اس لیے ظاہر ہُوا ہوں کہ پہلے مسیح کی طرح صلح اور آشتی کے دروازے کھول دُوں۔ اگر صلح کاری کی بنیاد درمیان نہ ہو تو پھر ہمارا سارا

---

[1] اشتہار چندہ منارۃ المسیح بر مت ضمیمہ خطبہ الہامیہ۔

بالکل فضول ہے اور اس پر ایمان لانا بھی فضول ہے۔[1]

ایک جگہ اور بھی صفائی اور اختصار کے ساتھ لکھا ہے:-

"میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔"[2]

انگریزی حکومت کا قلعہ اور تعویذ

مرزا صاحب نے اپنے عربی رسالہ نور الحق میں بڑی صفائی اور وضاحت کے ساتھ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ان کا وجود انگریزی حکومت کے لیے ایک قلعہ اور حصار اور تعویذ کی حیثیت رکھتا ہے، اپنی خدمات گناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فلی ان ادّعی التفرّد فی هذہ الخدمات ولی ان اقول انی وحید فی هذہ التائیدات ولی ان اقول انی حرز لها وحصن حافظ من الآفات وبشّرنی ربّی وقال ما کان الله لیعذّبهم وانت فیهم فلیس للدولة نظیری و

مجھے حق ہے کہ میں دعویٰ کروں کہ میں ان خدمات میں منفرد ہوں اور مجھے حق ہے کہ میں ان تائیدات میں یکتا ہوں اور مجھے حق ہے کہ میں کہوں کہ میں اس حکومت کے لیے بطور تعویذ اور ایسا قلعہ ہوں جو اس کو آفات و مصائب سے محفوظ رکھے خدا نے اور میرے رب نے مجھے بشارت دی اور فرمایا کہ اللہ ان کو عذاب نہیں دیگا جب تک تم ان میں ہو پس حقیقۃً اس حکومت کے پاس میرا کوئی ہمسر اور نظیر

---

[1] تریاق القلوب صفحہ ۳۲۵ [2] تبلیغ رسالت جلد ہفتم صفحہ ۱۷ ۔

مثیل فی نصرتی و عونی و ستعلم الدولة ان کانت من المتوسمین[1]

تائید میں میرا کوئی مثیل نہیں۔ اگر خدا نے اس حکومت کو نگاہ اور مردم شناسی عطا کی ہے تو وہ اس کی تصدیق کرے گی۔

خود کاشتہ پودا

مرزا صاحب نے اس درخواست میں جو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء میں پیش کی تھی، یہاں تک لکھا ہے:

"یہ التماس ہے کہ سرکار دولتمدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس سال کے متواتر تجربے سے ایک وفادار جاں نثار خاندان ثابت کر چکی اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کے خیر خواہ اور خدمت گزار ہے اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم و احتیاط اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔"[2]

کسی درخواست میں اپنے اور اپنی جماعت کے لیے "سرکار انگریزی کی نمک پروردہ اور نیک نامی حاصل کردہ اور مورد مراحم گورنمنٹ"

---

[1] نور الحق صفحہ ۳۴ [2] تبلیغ رسالت جلد ہفتم صفحہ ۱۹ ۔

کے الفاظ آتے ہیں۔

پادریوں کے مناظرے میں جوش اور تیزی کی وجہ

مرزا صاحب کو انگریزی حکومت کے ساتھ ایسا اخلاص اور اس کی خیر خواہی کا ایسا جذبہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے جوشِ نفرت کو کم کرنے کے لیے مختلف تدبیریں کرتے تھے۔ انھوں نے عیسائی مناظرین اور پادریوں کے مقابلے میں جس جوش اور سرگرمی کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان عیسائی پادریوں نے اسلام کی تردید اور پیغمبرِ اسلام کی توہین میں ایسا رویہ اختیار کیا تھا۔ جس سے مسلمانوں میں جوش و اشتعال پیدا ہو جانے اور حکومتِ وقت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اس لیے میں نے بھی مصلحۃً و قصداً ان کی تردید میں جوش و تاثر کا اظہار کیا تاکہ مسلمانوں کا جوشِ طبیعت فرو ہو جائے اور ان کو تسکین ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں اس بات کا بھی اقراری ہوں کہ جبکہ بعض پادریوں اور عیسائی مشنریوں کی تحریر نہایت سخت ہو گئی اور حدِ اعتدال سے بڑھ گئی، اور بالخصوص پرچہ "نور افشاں" میں جو ایک عیسائی اخبار لدھیانہ سے نکلتا ہے، نہایت گندی تحریریں شائع ہوئیں اور ان مولفین نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت نعوذ باللہ ایسے الفاظ استعمال کیے . . . .

. . . . تو مجھے ایسی کتابوں اور اخباروں کے پڑھنے سے یہ اندیشہ دل میں پیدا ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں میں جو ایک جوش رکھنے والی

قوم ہے۔ ان کلمات کا کوئی سخت اشتعال دینے والا اثر پیدا ہو۔ تب میں نے ان جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صحیح اور پاک نیت سے یہی مناسب سمجھا کہ اس عام جوش کو دبانے کے لیے حکمتِ عملی یہی ہے کہ ان تحریرات کا کسی قدر سختی سے جواب دیا جائے تا سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں کوئی بے امنی پیدا نہ ہو۔[1]

انگریزی حکومت کے رضاکار اور جاسوس

ان تعلیمات اور اس عقیدہ اور تبلیغ کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی حکومت کی وفاداری اور اخلاص اور اس کی خدمت کا جذبہ قادیانی جماعت کے ذہن اور اس کی سیرت و اخلاق کا ایک جزو بن گیا اور انگریزی حکومت کو اس جماعت میں سے ایسے مخلص خادم اور ایسے مستعد رضاکار ہاتھ آئے جنہوں نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر حکومت کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور اس کی خاطر اپنا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ افغانستان میں عبد اللطیف قادیانیت کا ایک پُر جوش داعی تھا جو جہاد کی برملا تردید کرتا تھا۔ وہ افغان قوم کے اس جذبۂ جہاد کو فنا کرنے کے درپے تھا، جس نے کبھی اس ملک میں کسی غیر مسلم فاتح یا حکمران کے قدم جمنے نہیں دیے اور جو انگریزی حکومت کو ہمیشہ پریشان کرتا رہا ہے۔ اسی بنا پر حکومتِ افغانستان نے اس کو قتل کر دیا۔ مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے خود اس کا ایک اطالوی مصنف کی کتاب کے حوالے

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۳۔ ضمیمہ کتاب تریاق القلوب صفحہ ۳۱۰ بعنوان "حضور گورنمنٹ عالیہ میں ایک عاجزانہ درخواست"۔

سے ذکر کیا ہے وہ فرماتے ہیں :

"وہ اطالوی مصنف لکھتا ہے کہ صاحبزادہ عبداللطیف صاحب کو اس وجہ سے شہید کیا گیا کہ وہ جہاد کے خلاف تعلیم دیتے تھے اور حکومت افغانستان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اس سے افغانوں کا جذبۂ حریت کمزور پڑ جائے گا اور اس پر انگریزوں کا اقتدار چھا جائے گا۔"[1]

اسی خطبہ میں وہ ارشاد فرماتے ہیں :

"اگر ہمارے آدمی افغانستان میں خاموش رہتے اور وہ جہاد کے باب میں جماعت احمدیہ کے مسلک کو بیان نہ کرتے تو شرعی طور پر ان پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر وہ اس پٹھے ہوئے جوش کا شکار ہو گئے، جو انھیں حکومت برطانیہ کے متعلق تھا اور وہ اسی ہمدردی کی وجہ سے مستحق سزا ہو گئے جو قادیان سے لے کر گئے تھے۔"[2]

اسی طرح ملا عبدالحلیم و ملا نور علی قادیانی کے پاس سے ایسی دستاویزیں اور خطوط برآمد ہوئے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ افغانی حکومت کے غدار اور انگریزی حکومت کے ایجنٹ اور جاسوس ہیں۔

اخبار "الفضل" نے افغانی اخبار "امان افغان" کے حوالے سے اس اطلاع کو شائع کیا۔ وہ لکھتا ہے :

---

[1] اخبار الفضل مورخہ ۶ اگست ۱۹۳۵ء [2] ایضاً

" افغان گورنمنٹ کے وزیر داخلیہ نے مندرجہ ذیل اعلان شائع کیا ہے :

کابل کے دو اشخاص مُلا عبد الحلیم چہار آسیائی اور مُلا نور علی دوکاندار قادیانی عقائد کے گرویدہ ہو چکے تھے اور لوگوں کو اس عقیدہ کی تلقین کر کے انھیں صلاح کی راہ سے بھٹکا رہے تھے۔ جمہور نے اُن کی اس حرکت سے مشتعل ہو کر ان کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مُجرم ثابت ہو کر عوام کے ہاتھوں پنجشنبہ ۱۱ رجب کو عدم آباد پہنچائے گئے ان کے خلاف مدّت سے ایک اور دعویٰ دائر ہو چکا تھا اور مملکت افغانیہ کے مصالح کے خلاف غیر ملکی لوگوں کے سازشی خطوط ان کے قبضے سے پائے گئے جن سے پایا جاتا ہے کہ وُہ افغانستان کے دشمنوں کے ہاتھ بِک چکے تھے۔"[لہ]

مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے اپنے اس سپاسنامہ میں جو ۱۹ جنوری ۱۹۲۲ء کو پرنس اوف ویلز کو پیش کیا تھا۔ ان واقعات کا فخریہ ذکر کیا اور ظاہر کیا کہ یہ سب قربانیاں انگریزی حکومت کے ساتھ اخلاص و وفاداری کا نتیجہ ہیں[سلہ]

بجُرمِ عشق تو‌ام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست

لہ الفضل مورخہ ۳ مارچ ۱۹۲۵ء — سلہ A present to His Royal Highness the Prince of Wales P.P. 7-8

اندازہ کی غلطی

مرزا صاحب حکومت برطانیہ کا اقبال اور اس کی وسعت و استحکام دیکھ کر یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کو کبھی زوال نہیں آئے گا۔ ان کے نزدیک اس سے وفاداری کا اظہار اور اس کی قسمت سے اپنی قسمت کو وابستہ کر دینا ایک بڑی سیاسی دُور بینی اور اعلیٰ درجہ کی تدبّر کی بات تھی حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دینی فراست اور سیاسی بصیرت دونوں سے محروم ہو۔ اس کا یہی فیصلہ اور اندازہ ہوگا۔ ان کے علم و ادراک پر یہ بات بالکل مخفی رہی کہ ان کے انتقال پر نصف صدی نہ گزرنے پائے گی کہ یہ غیر متزلزل انگریزی حکومت جس کو وُہ "سایۂ الٰہ" اور "دولتِ دین پناہ" سمجھتے تھے، ہندوستان سے اس طرح کوچ کر جائے گی کہ جیسے کبھی یہاں اس کا وجُود نہ تھا اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دُنیا میں اس کا ستارہ اقبال غروب ہو جائے گا۔

مرزا غلام احمد صاحب نے اس غیر اسلامی اور مخالف اسلام حکومت سے جس طرح اپنی نیاز مندی کا اظہار کیا ہے اور جس جوش کے ساتھ مسلمانوں کو محکومی اور غلامی کی زندگی کو نعمت سمجھنے کی تلقین کی ہے اس کو اس منصب و مقام سے کچھ مناسبت نہیں جس کے وُہ مدعی ہیں۔

اقبال مرحوم نے اسی بوالعجبی اور تضاد کی طرف اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے ؎

شیخ او مردِ فرنگی را مرید

گرچہ گوید از مقامِ بایزید

گفت دیں را رونق از محکومیست
زندگانی از خودی محرومیست
دولت اغیار را رحمت شمرد
رقصہا گرد کلیسا کرد و مرد[۱]

---

۱ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق

فصل سوم

مرزا غلام احمد صاحب کی درشت کلامی اور دشنام طرازی

انبیاء اور اُن کے متبعین کا طرزِ کلام

انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کے متعلق یقینی اور تواتر سے معلوم ہے کہ وہ نہایت شیریں کلام پاکیزہ زبان، صابر و متحمل، عالی ظرف، فراخ حوصلہ اور دشمن نواز ہوتے ہیں وہ دشنام کا جواب سلام سے، بد دعا کا جواب دعا سے، تکبّر کا جواب فروتنی سے اور رذالت کا جواب شرافت سے دیتے ہیں۔ اُن کی زبان کبھی کسی کے دشنام اور کسی فحش کلام سے آلودہ نہیں ہوتی۔ طنز و تعریض، تفضیح و تضحیک، ہجو، ملیح، ضلع جگت وغیرہ سے اُن کی فطرتِ عالی کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ وہ اگر کسی کی تردید یا مذمت کرتے ہیں تو سادہ اور واضح الفاظ میں۔ وہ کسی کے نسب پر حملہ کرنے، اُس کے خاندان یا آباء و اجداد پر الزام لگانے اور درباری شاعروں اور لطیفہ گروں کی طرح چٹکی لینے اور فقرہ چست کرنے کے فن سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں۔ اُن کا کلام (موافقت و مخالفت دونوں موقعوں پر) اُن کی سیرت اور فطرت کی طرح پاکیزہ، معتدل، متوازن اور واضح ہوتا ہے۔ صحابۂ کرام آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی تعریف میں فرماتے ہیں:

ما کان رسول اللہ صلی	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ عادۃً
اللہ علیہ وسلم فاحشًا و لا	سخت گو تھے نہ بہ تکلف سخت گو بنتے تھے نہ بازاروں
متفحشًا و لا صخابًا فی الاسواق	میں خلاف وقار باتیں کرنے والے تھے (ترمذی)

خود آپ نے مومن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

لیس المومن بالطعان و لا	مومن نہ طعن و تشنیع کرنے والا ہوتا ہے، نہ
باللعان و لا الفاحش و لا البذی	لعنت بھیجنے والا، نہ سخت گو نہ فحش کلام (ترمذی)

اس کے مقابلہ میں آپ نے منافق کی صفات میں ایک صفت یہ بھی بیان کی ہے!

وَ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ	جب اس کو کسی سے جھگڑا ہوتا ہے تو فوراً
(بخاری و مسلم)	گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام اور بالخصوص جناب سیدالانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان تو بہت رفیع ہے، اُن کے غلام بھی ان پستیوں سے بلند ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے دشمنوں اور بدخواہوں کے حق میں اکثر یہ کہتے ہوئے سُنا گیا ہے۔

ہر کہ مارا یار نبود ایزد او را یار باد
ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد
ہر کہ او خارے نہد در راہ ما از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

خود مرزا صاحب کو تسلیم ہے کہ پیشواؤں اور ان ہستیوں کے لیے جو امامت اور دینی عظمت کے مرتبہ سے سرفراز ہوں تحمل، ضبطِ نفس اور عفو و حلم کی صفت بہت ضروری ہے۔ "ضرورۃ الامام" میں لکھتے ہیں :

"چونکہ اماموں کو طرح طرح کے اوباشوں، سفلوں اور بدزبان لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس لیے اُن میں اعلیٰ درجہ کی اخلاقی قوت کا ہونا ضروری ہے تاکہ اُن میں طیشِ نفس اور مجنونانہ جوش پیدا نہ ہو اور لوگ اُن کے فیض سے محروم نہ رہیں۔ یہ نہایت قابلِ شرم بات ہے کہ ایک شخص خدا کا دوست کہلا کر پھر اخلاقِ رذیلہ میں گرفتار ہو اور درست بات کا ذرا بھی متحمل نہ ہو سکے اور جو امامِ زمان کہلا کر ایسی کچی طبیعت کا آدمی ہو کہ ادنیٰ بات میں مُنہ میں جھاگ آتا ہے، آنکھیں نیلی پیلی ہوتی ہیں وہ کسی طرح سے امامِ زمان نہیں ہو سکتا۔"[1]

لیکن اس کے بالکل برعکس مرزا غلام احمد صاحب نے اپنے مخالفین کو (جن میں جلیل القدر علماء اور عظیم المرتبت مشائخ تھے) ان الفاظ سے یاد کیا ہے اور اُن کی ان الفاظ میں ہجو کی اور خاک اُڑائی ہے کہ بار بار تہذیب کی نگاہیں نیچی اور حیا کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ ان مخالفین کے لیے ذُرّیۃُ البغایا (بدکار عورتوں کی اولاد) کا کلمہ تو مرزا صاحب کا تکیہ کلام[2]

---

[1] صفحہ ۸ ۔ [2] ملاحظہ ہو، آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۵۴۷، نور الحق حصہ اول صفحہ ۱۲۳، انجام آتھم صفحہ ۲۸۲ وغیرہ وغیرہ۔

ان کی اس ہجو کے زیادہ تیز اور شوخ نمونے عربی نظم و نثر میں ہیں لیکن چونکہ اصنافِ ادب میں سے طنزیات و ہجویات کا ترجمہ سب سے زیادہ نازک اور مشکل کام ہے۔ اس لیے یہاں چند ہی نمونوں کے ترجمے پیش کیے جاتے ہیں:۔

کتاب انجام آتھم کے ضمیمہ میں فرماتے ہیں:۔

"اگر یہ گالی دیتے ہیں تو میں نے اُن کے کپڑے اتار لیے ہیں اور اُن کو ایسا مُردار بنا کر چھوڑ دیا ہے جو پہچانا نہیں جاتا۔"[1]

دُوسری جگہ اپنے مخالفین کو اس طرح یاد کرتے ہیں:

"دشمن ہمارے بیابانوں کے خنزیر ہو گئے ہیں اور اُن کی عورتیں کتیوں سے بڑھ گئی ہیں۔"[2]

اُنھوں نے اپنے حریف مقابل مولوی سعد اللہ صاحب لدھیانوی کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے کہ قلم بھی اُس کا ترجمہ کرنے سے معذرت کرتا ہے اس لیے عربی دان اصحاب کے لیے اصل اشعار نقل کر دیے جاتے ہیں۔

ومن اللئام اریٰ رجیلاً فاسقاً	غولاً لعینا نُطفۃ السّفہاء
شکس خبیث مُفسد و مُزوّرٌ	نحس یُسمّیٰ السّعد فی الجہلاء
اٰذیتنی خُبثاً فلست بصادق	اِن لم تمت بالخزی یا ابن بغاء[3]

اُنھوں نے ایک ہی مقام پر اپنے عصر کے اکابر علماء و شیوخ کو جو اسلامی ہندوستان

---

[1] صفحہ ١٥٠ [2] نجم الہدیٰ صفحہ ١٥ [3] انجام آتھم صفحہ ٢٨١، ٢٨٢

کا جوہر اور عالم اسلام کے چیدہ و برگزیدہ بزرگ، عارف باللہ اور جید عالم تھے، اپنے ہجو و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے۔ ان میں مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی، مولانا عبدالحق حقانی، مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا احمد حسن امروہی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے اعاظم رجال ہیں۔ ان کے لیے انھوں نے ذئاب و کلاب، شیطان لعین، شیطان اعمٰی، غول اغویٰ اور شقی و ملعون کے الفاظ استعمال کیے ہیں[1]۔

اسی طرح اپنے زمانے کے مشہور عالم اور شیخ طریقت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کی شان میں ایک ہجویہ قصیدہ لکھا ہے جس کے دو شعروں کا ترجمہ انھیں کے قلم سے حسب ذیل ہے:

"ہم نے کہا کہ اے گولڑہ کی زمین تجھ پر لعنت۔ تو ملعون کے سبب سے ملعون ہو گئی۔ پس تو قیامت کو ہلاکت میں پڑے گی۔ اس فرومایہ نے کمینہ لوگوں کی طرح گالی کے ساتھ بات کی ہے اور ہر ایک آدمی خصومت کے وقت آزمایا جاتا ہے۔"[2]

ان مطاعن اور درشت کلامیوں سے بھی ان کی پرجوش طبیعت کو تسکین نہیں ہوتی۔ وہ بعض موقعوں پر مخالفین پر لعنت کرتے ہوئے لعنت کی تعداد کو کسی ایک عدد میں ظاہر کرنے کے بجائے لفظ لعنت کو علیحدہ علیحدہ لکھتے ہیں۔ ضمیمہ نزول المسیح میں

---

[1] ملاحظہ ہو انجام آتھم کے آخر میں مرزا صاحب کا طویل عربی مکتوب صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲ [2] اعجاز احمدی صفحہ ۷۶، ۷۷

انھوں نے مولانا ثناء اللہ صاحب کے لیے دس مرتبہ لعنت لکھا ہے اور نورالحق میں عیسائیوں کے لیے ایک ہزار بار لعنت کا لفظ لکھا ہے۔ "یہ لعنت نامہ" ان کے جوش طبیعت کا عجیب مرقع ہے۔[1]

یہاں پر مرزا صاحب کے طرزِ کلام کے چند مزید نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ جن میں انھوں نے اپنے مخالف علماء کو مجموعی طور پر مخاطب کیا ہے۔ انجام آتھم کے ایک حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں:

"اے بدذات فرقۂ مولویان! تم کب تک حق کو چھپاؤ گے، کب وہ وقت آئے گا کہ تم یہودیانہ خصلت کو چھوڑو گے۔ اے ظالم مولویو! تم پر افسوس، کہ تم نے جس بے ایمانی کا پیالہ پیا، وہی عوام کالانعام کو بھی پلایا۔"[2]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"دنیا میں سب جانداروں سے زیادہ پلید اور کراہت کے لائق خنزیر ہے، مگر خنزیر سے زیادہ پلید وہ لوگ ہیں جو اپنے نفسانی جوش کے لیے حق اور دیانت کی گواہی کو چھپاتے ہیں۔ اے مردار خور مولویو! اور گندی روحو! تم پر افسوس کہ تم نے میری عداوت کے لیے اسلام کی سچی گواہی کو چھپایا۔ اے اندھیرے کے کیڑو! تم سچائی کے

---

[1] نورالحق صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۵ [2] انجام آتھم حاشیہ صفحہ ۲۱

تیز شاعروں کو کیونکر چھپا سکتے ہو"۔[1]

اسی تحریر میں لکھتے ہیں:

"مگر کیا یہ لوگ قسم کھا لیں گے؟ ہرگز نہیں کیونکہ یہ جھوٹے ہیں اور کتوں کی طرح جھوٹ کا مُردار کھا رہے ہیں"۔[2]

یہ موضوع نہ تو محررِ سطور کے لیے خوشگوار ہے نہ قارئینِ کتاب کے لیے دلچسپ و مرغوب، اس لیے ہم انھیں چند نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

---

[1] ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۲۱، حاشیہ [2] ایضاً صفحہ ۲۵

فصلِ چہارم

ایک پیش گوئی جو پوری نہیں ہوئی !!

محمدی بیگم سے نکاح کی پیش گوئی

۱۸۸۸ء میں مرزا غلام احمد صاحب نے (جبکہ اُن کی عمر پچاس سال کی تھی) اپنے ایک رشتہ دار مرزا احمد بیگ کی نوعمر صاحبزادی محمدی بیگم کے نکاح کا پیام دیا۔ ان کا بیان ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اس بات کے لیے مامور تھے اور خدا نے صاف اور صریح الفاظ میں اس کام کی تکمیل کا وعدہ فرمایا تھا۔ وہ اپنے ایک اشتہار میں جو ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو شائع اور تقسیم ہوا لکھتے ہیں:

"اس خدائے قادر حکیم مطلق نے مجھے فرمایا کہ اس شخص (احمد بیگ) کی دخترِ کلاں کے نکاح کے لیے سلسلہ جنبانی کر اور ان کو کہہ دے کہ تمام سلوک اور مروّت تم سے اسی شرط کے ساتھ کیا جائے گا اور یہ نکاح تمہارے لیے موجب برکت اور ایک رحمت کا نشان ہوگا اور ان تمام برکتوں رحمتوں سے حصہ پاؤ گے جو اشتہار ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء میں درج ہیں۔ لیکن

اگر نکاح سے انحراف کیا تو اس لڑکی کا انجام نہایت ہی بُرا ہوگا اور جس کسی دُوسرے شخص سے بیاہی جائے گی وُہ روزِ نکاح سے اڑھائی سال تک اور ایسا ہی والد اس دختر کا تین سال تک فوت ہو جائے گا اور اُن کے گھر پر تفرقہ اور تنگی اور مصیبت پڑے گی اور درمیانی زمانہ میں بھی اس دختر کے لیے کئی کراہت اور غم کے امر پیش آئیں گے۔"[1]

"ازالۂ اوہام میں اس پیش گوئی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

"خدائے تعالیٰ نے پیش گوئی کے طور پر اس عاجز پر ظاہر فرمایا کہ مرزا احمد بیگ ولد مرزا گاماں بیگ ہوشیار پوری کی دخترِ کلاں انجام کار تمھارے نکاح میں آئے گی اور وُہ لوگ بہت عداوت کریں گے اور بہت مانع آئیں گے اور کوشش کریں گے کہ ایسا نہ ہو لیکن آخر کار ایسا ہی ہوگا اور فرمایا کہ خدائے تعالیٰ ہر طرح سے اس کو تمھاری طرف لائے گا۔ باکرہ ہونے کی حالت میں یا بیوہ کر کے اور ہر ایک روک درمیان سے اٹھا دے گا اور اس کام کو ضرور پورا کرے گا، کوئی نہیں جو اس کو روک سکے۔"[2]

پیشگوئی کی اہمیت اور اس کی قطعیت

یہ مسئلہ اگرچہ ایک خانگی مسئلہ تھا اور کسی مورخ یا ناقد کو ایسے خانگی و ذاتی مسائل سے کوئی بحث

---

[1] یہ اشتہار ریاض ہند امرتسر کا چھپا ہوا ۱۸۸۸/۷/۱۰ کے آٹھ صفحہ ہیں۔ نیچے اس کو مرزا صاحب نے بجنسہٖ آئینہ کمالات اسلام میں نقل کیا ہے، صفحہ ۲۸۶۔ اور قاسم علی صاحب قادیانی نے تبلیغ رسالت جلد اول میں درج کیا ہے صفحہ ۱۱۱ - ۱۱۸)

[2] ازالۂ اوہام صفحہ ۱۹۸

نہیں ہونی چاہیے۔ دُنیا میں لوگ شادی کے پیام دیتے ہیں، کبھی منظور ہوتے ہیں کبھی منظور نہیں ہوتے۔ لیکن اس پیام اور اس واقعہ کو ایک خاص اہمیت اور امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ مرزا صاحب نے اس کو اپنے صدق و کذب کا معیار اور اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ اسی اشتہار میں اپنی اس پیش گوئی کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"یہ خیال لوگوں کو واضح ہو کہ ہمارا صدق یا کذب جانچنے کے لیے ہماری پیش گوئی سے بڑھ کر اور کوئی محکِ امتحان نہیں ہو سکتا"[1]

یہ بھی خیال ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات غیبی اطلاع کے سمجھنے میں اشتباہ ہو جاتا ہے اور مُلہم الفاظ کے اشتراک کی وجہ سے اس کا کوئی غلط مصداق ٹھہرا لیتا ہے لیکن خود مرزا صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیش گوئی میں جو بڑی تحدی اور چیلنج کے ساتھ مخالفوں کے سامنے پیش کی گئی تھی، اس شبہ کا کوئی جواز نہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

"جن پیش گوئیوں کو مخالف کے سامنے دعوے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہ ایک خاص طور کی روشنی اور ہدایت اپنے اندر رکھتی ہیں اور مُلہم لوگ حضرتِ احدیت میں خاص طور پر توجہ کر کے ان کا زیادہ تر انکشاف کرا لیتے ہیں"[2]

ممکن ہے لوگ اس پیش گوئی کو زیادہ اہمیت نہ دیتے۔ مرزا صاحب کی زندگی میں ان پیش گوئیوں میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ ان کی تصنیفات، اشتہارات اور ان کی عرفی زندگی

---

[1] آئینۂ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۸۸ [2] ازالۂ اوہام صفحہ ۲۰۲

ان پیش گوئیوں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن اس پیش گوئی میں خاص انفرادیت اور تشخص ہے مرزا صاحب نے اس کو ایک نشانِ آسمانی اور فیصلۂ آسمانی کے طور پر پیش کیا اور اس کو نہ صرف اپنے صدق و کذب بلکہ اسلام کی فتح و شکست کا معیار بنا دیا۔ وہ ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء کے مذکورۂ بالا اشتہار میں لکھتے ہیں:-

"پھر ان دنوں میں جو زیادہ تصریح اور تفصیل کے لیے بار بار توجہ کی گئی تو معلوم ہوا کہ خدائے تعالیٰ نے یہ مقرر کر رکھا ہے کہ وہ مکتوب الیہ (مرزا احمد بیگ) کی دختر کلاں کو جس کی نسبت درخواست کی گئی تھی ہر ایک روک دُور کرنے کے بعد انجام کار اسی عاجز کے نکاح میں لاوے گا اور بے دینوں کو مسلمان بنا دے گا اور گمراہوں میں ہدایت پھیلا دے گا چنانچہ عربی الہام میں اس بارے میں یہ ہے: کذبوا بآیٰتنا وکانوا بہا یستھزءون ۔ فسیکفیکھم اللہ ویردھا الیک لا تبدیل لکلمٰت اللہ ۔ ان ربک فعال لما یرید ۔ انت معی وانا معک عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً ۔ یعنی انھوں نے ہمارے نشانوں کو جھٹلایا اور وہ پہلے سے ہنسی کر رہے تھے۔ سو خدائے تعالیٰ ان سب کے تدارک کے لیے جو اس کام کو روک رہے ہیں تمھارا مددگار ہوگا اور انجام کار اس کی اس لڑکی کو تمھاری طرف واپس لائے گا۔ کوئی نہیں جو خدا کی باتوں کو ٹال سکے۔ تیرا رب وہ قادر ہے کہ جو کچھ چاہے وہی ہو جاتا ہے۔ تو میرے

ساتھ اور میں تیرے ساتھ ہوں اور عنقریب وہ مقام تجھے ملے گا جس میں تیری تعریف کی جائے گی۔ یعنی گو مل میں احمق اور نادان لوگ بد باطنی اور بدظنی کی راہ سے بدگوئی کرتے ہیں اور نالائق باتیں مونہہ پر لاتے ہیں۔ لیکن آخرکار خدائے تعالیٰ کی مدد دیکھ کر شرمندہ ہوں گے اور سچائی کے کھلنے سے چاروں طرف سے تعریف ہوگی"۔[1]

اس کے بعد بھی امکان تھا کہ لوگ اپنی مشغولیتوں میں اس قصہ کو بھول جاتے لیکن مرزا صاحب کو اس درجہ اس پیش گوئی کی تکمیل پر یقین تھا کہ وہ بار بار اس کا اعادہ کرتے رہتے تھے اور زیادہ سے زیادہ طاقتور اور مؤکّد الفاظ میں اس کا اعلان فرماتے تھے۔ وہ آسمانی فیصلہ میں فرماتے ہیں:-

"اشتہار دہم جولائی ۱۸۸۸ء کی پیش گوئی کا انتظار کریں جس کے ساتھ یہ بھی الہام ہے: ویستلونک احق ھو قل ای وربی انہ لحق وما انتم بمعجزین زوجناکھا لا مبدل لکلماتی وان یروا ایۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر۔ اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات سچ ہے۔ کہ ہاں، مجھے اپنے رب کی قسم ہے کہ یہ سچ ہے اور تم اس بات کو وقوع میں آنے سے روک نہیں سکتے۔ ہم نے خود اس سے تیرا عقد نکاح باندھ دیا ہے۔ میری باتوں کو کوئی بدلا نہیں سکتا اور نشان دیکھ کر منہ پھیر لیں گے

---

[1] آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۲۸۶، تبلیغ رسالت حصہ اوّل صفحہ ۱۱۶

اور قبول نہیں کریں گے اور کہیں گے، یہ کوئی پکّا فریب یا پکّا جادو ہے۔"[1]

اپنے اس عربی خط میں جو علماء و مشائخ ہندوستان کے نام تحریر کیا ہے، فرماتے ہیں:

"والقضاء قد مبرم من عند الرب العظیم وسیلقی وقتہ بفضل الله الکریم ھو الذی بعث لنا محمدًا المصطفٰی وجعلہ خیر الرسل وخیر الوریٰ۔ ان ھذا حق فسوف تری وانی اجعل ھذا النبأ معیارًا لصدقی وکذبی وما قلت الا بعد ما انبئت من ربی۔"[2]

تقدیر تقدیرِ مبرم ہے جس کا خدا کی طرف سے آخری فیصلہ ہو چکا ہے اور اس کا وقوع بفضل خدائے کریم ہوگا۔ قسم اس ذاتِ پاک کی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور آپ کو تمام انبیاء اور تمام مخلوقات میں افضل بنایا، یہ پکّا امر حق ہے تم کو خود معلوم ہو جائے گا اور میں اس پیش گوئی کو اپنے صدق و کذب کا معیار ٹھہراتا ہوں اور میں نے اس وقت تک یہ بات نہیں کہی جب تک مجھے اپنے رب کی طرف سے اس کی اطلاع نہیں دی گئی۔

"ازالۂ اوہام" میں اس پیش گوئی کی عظمت اور اس کے نشانِ آسمانی ہونے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس (پیش گوئی) کی نسبت آریوں کے بعض منصف مزاج لوگوں نے بھی شہادت دی ہے کہ اگر یہ پیش گوئی پوری ہو جائے تو بلاشبہ خدا کا فعل ہے اور یہ پیش گوئی ایک سخت قوم کے مقابل پر ہے جنہوں نے گویا دشمنی اور عناد کی تلواریں کھینچی ہوئی ہیں اور ہر ایک کو جس کو ان کے حال کی خبر ہوگی وہ

---

[1] فیصلۂ آسمانی صفحہ ۴۰   [2] انجام آتھم صفحہ ۲۲۳

اس پیش گوئی کی عظمت خوب سمجھتا ہوگا۔ جو شخص اشتہار کو پڑھے گا، وہ گو کیسا ہی متعصب ہوگا، اس کو اقرار کرنا پڑے گا کہ مضمون اس پیش گوئی کا انسان کی قدرت سے بالاتر ہے"۔[۱]

مرزا صاحب کو شدتِ علالت اور قربِ وفات کے خطرہ سے جب کبھی اس پیش گوئی کے بارے میں تردد ہوا جدید الہام کے ذریعے سے ان کو اس کا اطمینان دلا دیا گیا۔ ازالۂ اوہام میں لکھتے ہیں:

"جب یہ پیش گوئی معلوم ہوئی اور ابھی پوری نہیں ہوئی تھی (جیسا کہ اب تک بھی جو ۱۶ راپریل ۱۸۹۱ء ہے، پوری نہیں ہوئی) تو اس کے بعد اس عاجز کو ایک سخت بیماری آئی، یہاں تک کہ قریب موت کے نوبت پہنچ گئی بلکہ موت کو سامنے دیکھ کر وصیت بھی کر دی گئی۔ اس وقت گویا یہ پیش گوئی آنکھوں کے سامنے آگئی اور یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اب آخری دم ہے اور کل جنازہ نکلنے والا ہے۔ تب میں نے اس پیش گوئی کی نسبت خیال کیا کہ شاید اس کے اور معنی ہوں گے جو میں سمجھ نہیں سکا، تب اسی حالت قریب الموت میں مجھے الہام ہوا۔ الحق من ربک فلا تکونن من الممترین یعنی یہ بات تیرے رب کی طرف سے سچ ہے تو کیوں شک کرتا ہے"۔[۲]

غرض محمدی بیگم سے نکاح مرزا صاحب کے نزدیک ایک طے شدہ امر تھا جس

---

[۲] ازالۂ اوہام صفحہ ۱۹۹

کا فیصلہ آسمان پر ہو چکا تھا اور جس میں تغیر و تخلف کا کوئی امکان نہ تھا۔ انھوں نے اس کو نہ صرف اپنے صدق و کذب بلکہ اپنے خبر دینے والے کے صدق و کذب کا معیار بنا دیا تھا اور چونکہ اپنے کو وہ اسلام کا صحیح نمائندہ اور وکیل اور اپنی عزت کو اسلام کی عزت سمجھتے تھے۔ اس موقع پر اسلام کی فتح و شکست کا سوال کھڑا کر دیا تھا۔

مرزا احمد بیگ کا انکار اور مرزا صاحب کا اصرار

مرزا احمد بیگ نے مرزا غلام احمد صاحب کا پیام نامنظور کیا اور اپنے ایک عزیز مرزا سلطان محمد سے اپنی لڑکی کا عقد کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مرزا صاحب کو اس کا علم تھا مسئلہ (خود مرزا صاحب کے جوش اور خود اعتمادی کی وجہ سے) خاندانی حدود سے نکل کر پبلک میں آچکا تھا اور اخباروں اور رسالوں کا عنوان اور مجلسوں کا موضوع سخن بنا ہوا تھا۔ ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کو اس مسئلہ سے ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی جو اپنی خصوصیات اور امتیازی شان کی وجہ سے بالعموم شاہی خاندان اور مشاہیر کی شادیوں اور رشتہ داریوں سے بھی نہیں ہوتی، مرزا صاحب نے اپنے بار بار کے اشتہارات اور تحدی سے خود اس مسئلہ کو پیچیدہ اور نازک بنا دیا تھا۔ لڑکی کے خاندان کے لوگوں نے (جو مرزا صاحب سے دینی اختلاف بھی رکھتے تھے اور جن کی خودداری اور شرافت کو مرزا صاحب کے اعلانات اور تشہیر سے ٹھیس لگی تھی) لڑکی کو مرزا صاحب کے حبالہ عقد میں دینے سے انکار کر دیا۔ مسئلہ اب ایسا مابہ النزاع اور پیچیدہ بن گیا تھا کہ مرزا صاحب کے لیے اس رشتہ کا ہو جانا ضروری تھا۔ وہ اتنے واضح اور قطعی الفاظ میں اس کی پیشگوئی اور یقین دہانی کر چکے تھے کہ ان کے لیے نہ

اس سے دستبردار ہونا ممکن تھا نہ اس کی تاویل، خود مرزا صاحب اصولاً اس کے قائل تھے کہ ملہم کو پیش گوئی کی تکمیل کے لیے خود بھی جد وجہد اور تدبیر کرنی چاہیے اور یہ اس کے منصب و مقام کے منافی نہیں[1]۔ اسی بنا پر خلیل مسیح کی پیش گوئی کے ایک جُز "منارۃ شرقی" کی تعمیر کا انھوں نے اہتمام کیا تھا اور اپنی زندگی میں اس کا آغاز کر دیا تھا۔ اسی اصول کی بنا پر انھوں نے محمدی بیگم کے دل اس کے والد اور اس کے رشتہ داروں کو ہر طرح سے اس رشتہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس کے لیے ترغیب و ترہیب کے تمام ذرائع اختیار کیے۔ ان کی درخواست اور ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء کے اشتہار میں بھی۔ دونوں پہلو (ترغیب و ترہیب) موجود ہیں۔ وہ عقد ہو جانے کی حالت میں انعامات خداوندی کا وعدہ کرتے ہیں اور انکار کی حالت میں اس کے اُجڑ جانے کی پیش گوئی کرتے ہیں۔

اس موقع پر انھوں نے لڑکی کے والد مرزا احمد بیگ اور اس کے پھوپھا مرزا علی شیر بیگ اور پھوپھی اور ان دوسرے اعزہ کو جو اس رشتہ کے بارے میں موثر و مفید ہو سکتے تھے، بڑی لجاجت اور خوشامد کے خط لکھے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر یہ رشتہ کرا دیں۔ مرزا احمد بیگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اگر آپ نے میرا قول اور بیان مان لیا تو مجھ پر مہربانی اور احسان اور میرے ساتھ نیکی ہوگی۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں گا، اور آپ کی درازیٔ

---

[1] وہ حقیقۃ الوحی میں لکھتے ہیں "اگر وحی الٰہی کوئی بات بطور پیش گوئی ظاہر فرماوے اور ممکن ہو کہ انسان بغیر کسی فتنہ اور ناجائز طریق کے اس کو پورا کر سکے تو اپنے ہاتھ سے اس پیش گوئی کو پورا کرنا نہ صرف جائز بلکہ مسنون ہے" صفحہ ۱۹۱۔

عمر کے لیے ارحم الراحمین کے جناب میں دعا کروں گا۔ اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی لڑکی کو اپنی زمین اور مملوکات کا ایک تہائی حصہ دوں گا اور میں سچ کہتا ہوں کہ ان میں سے جو کچھ مانگیں گے میں آپ کو دوں گا۔"[1]

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"میں اب بھی عاجزی اور ادب سے آپ کی خدمت میں ملتمس ہوں کہ اس رشتہ سے آپ انحراف نہ فرمائیں کہ یہ آپ کی لڑکی کے لیے نہایت درجہ موجب برکت ہوگا اور خدا تعالیٰ ان برکتوں کا دروازہ کھولے گا جو آپ کے خیال میں نہیں۔"[2]

مرزا علی شیر بیگ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اگر آپ کے گھر کے لوگ سخت مقابلہ کر کے اپنے بھائی کو سمجھاتے تو کیوں نہ سمجھ سکتا، کیا میں چوہڑا یا چمار تھا جو مجھ کو لڑکی دینا عار یا ننگ تھی بلکہ وہ تو اب تک ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور اپنے بھائی کے لیے مجھے چھوڑ دیا اور اب اس لڑکی کے نکاح کے لیے سب ایک ہو گئے۔ یوں تو مجھے کسی کی لڑکی سے کیا غرض؟ کہیں جائے مگر یہ تو آزمایا گیا کہ جن کو میں خویش سمجھتا تھا اور جن کی لڑکی کے لیے چاہتا تھا کہ اس کی اولاد ہو اور وہ میری

---

[1]، [2] کلمۂ فضل رحمانی مؤلفہ قاضی فضل احمد صاحب (ماخوذ از قادیانی مذہب) کلمۂ فضل رحمانی مرزا صاحب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے محمدی بیگم کے رشتہ داروں اور سرپرستوں کو بھیجے۔ ان خطوط کی صحت اور ان کی مرزا صاحب کی طرف نسبت سے مرزا صاحب کو بھی انکار نہ تھا۔

وارث ہو، وہی میرے خون کے پیاسے، وہی میری عزت کے پیاسے ہیں کہ چاہتے ہیں کہ خوار ہو اور اس کا روسیاہ ہو۔ خدا بے نیاز ہے جس کو چاہے روسیاہ کرے مگر اب تو وہ مجھے آگ میں ڈالنا چاہتے ہیں"[1]

آپ نے مرزا احمد بیگ کے نام ایک خط میں یہ بھی لکھا کہ:

"آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ یہ پیش گوئی اس عاجز کی ہزارہا لوگوں میں مشہور ہو چکی اور میرے خیال میں شاید دس لاکھ سے زیادہ آدمی ہوگا جو اس پیش گوئی پر اطلاع رکھتا ہے"[2]

اسی خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے لاہور میں جا کر معلوم کیا کہ ہزاروں مسلمان مساجد میں نماز کے بعد اس پیش گوئی کے ظہور کے لیے بصدقِ دل دعا کرتے ہیں"[3]

مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ اُن کی بہو عزت بی بی فضل احمد مرحوم کی اہلیہ اور اس کی والدہ اہلیہ مرزا علی شیر بیگ جو لڑکی کی پھوپھی تھیں، مرزا صاحب کے نکاح کی مخالف اور مرزا سلطان محمد سے محمدی بیگم کے نکاح کے لیے ساعی اور مؤید ہیں۔ مرزا صاحب نے اپنے سمدھی مرزا علی شیر بیگ کو لکھا:

"میں نے اُن کی خدمت میں (اہلیہ مرزا علی شیر بیگ کی خدمت میں) خط لکھ دیا ہے کہ اگر آپ اپنے ارادہ سے باز نہ آئیں اور اپنے بھائی

---

[1] کلمۂ فضلِ رحمانی [2] کلمۂ فضلِ رحمانی (ماخوذ از قادیانی مذہب) [3] کلمۂ فضلِ رحمانی (ماخوذ از قادیانی مذہب)

(مرزا احمد بیگ) کو اس نکاح سے روک نہ دیں تو جیسا کہ آپ کی خود منشا ہے، میرا بیٹا فضل احمد بھی آپ کی لڑکی (حرمت بی بی) کو اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ ایک طرف جب (محمدی) کا کسی شخص سے نکاح ہوگا تو دوسری طرف فضل احمد آپ کی لڑکی کو طلاق دے دے گا۔ اگر نہیں دے گا تو میں اس کو عاق اور لاوارث کر دوں گا اور اگر میرے لیے احمد بیگ سے مقابلہ کرو گے اور یہ ارادہ اس کا بند کرا دو گے تو میں بدل و جان حاضر ہوں اور فضل احمد کو جواب میرے قبضہ میں ہے ہر طرح سے درست کر کے آپ کی لڑکی کی آبادی کے لیے کوشش کروں گا اور میرا مال اس کا مال ہوگا۔"[1]

مرزا صاحب نے حرمت بی بی سے بھی اپنی والدہ کے نام خط لکھوایا جس میں اس نے لکھا کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو واقعی مرزا صاحب میرے شوہر سے مجھے طلاق دلوا دیں گے اور میری خانہ بربادی ہو جائے گی۔"[2]

فضل احمد مرحوم نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ مرزا صاحب کے دوسرے صاحبزادے مرزا سلطان احمد بھی محمدی بیگم کے گھر والوں کے ہمنوا نکلے اور ان کی والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں، اس لیے مرزا صاحب نے مرزا سلطان احمد کو بالفاظ خود عاق اور محروم الارث اور اُن کی والدہ کو طلاق دے دی۔[3]

---

[1] کلمۂ فضلِ رحمانی [2] کلمۂ فضلِ رحمانی [3] تبلیغ رسالت جلد دوم صفحہ ۹

بالآخر ۷ اپریل ۱۸۹۲ء کو محمدی بیگم کا مرزا سلطان محمد سے نکاح ہو گیا۔ مگر مرزا غلام احمد صاحب اس کے بعد بھی پیش گوئی کی تکمیل سے مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۰۱ء میں عدالت ضلع گورداسپور میں حلفیہ بیان میں کہا:

"یہ سچ ہے وہ عورت میرے ساتھ بیاہی نہیں گئی مگر میرے ساتھ اس کا بیاہ ضرور ہوگا جیسا کہ پیش گوئی میں درج ہے۔ وہ سلطان محمد سے بیاہی گئی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس عدالت میں جہاں ان باتوں پر جو میری طرف سے نہیں ہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہیں ہنسی کی گئی ہے، ایک وقت آتا ہے کہ عجیب اثر پڑے گا اور سب کے ندامت سے سر نیچے ہو جائیں گے

عورت اب تک زندہ ہے میرے نکاح میں وہ عورت ضرور آئے گی۔ امید یقین کامل ہے۔ خدا کی باتیں ہیں ٹلتی نہیں ہو کر رہیں گی۔"[1]

مرزا صاحب نے اپنے پہلے اشتہار میں پیش گوئی کی تھی کہ جس کسی دوسرے شخص سے محمدی بیگم کا نکاح ہوگا وہ اڑھائی سال کے اندر انتقال کر جائے گا۔ یہ ڈھائی سال کی مدت گزر گئی اور مرزا سلطان محمد صاحب بقید حیات تھے اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ مرزا صاحب نے اس میعاد کے گزر جانے کے بعد اس میں توسیع فرما دی، وہ اپنے اشتہار مورخہ ۶ ستمبر ۱۸۹۴ء میں لکھتے ہیں:

"عذاب کی میعاد ایک تقدیر معلق ہوتی ہے جو خوف اور رجوع سے

---

[1] اخبار الحکم ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء (ماخوذ از قادیانی مذہب۔ تحقیق لاثانی)

دوسرے وقت پر جا پڑتی ہے جیسا کہ تمام قرآن اس پر شاہد ہے لیکن نفس پیش گوئی یعنی اس عورت کا اس عاجز کے نکاح میں آنا یہ تقدیر مبرم ہے۔ جو کسی طرح ٹل نہیں سکتی کیونکہ اس کے لیے الہام الٰہی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ لا تبدیل لکلمات اللہ، یعنی میری بات ہرگز نہیں ٹلے گی۔ پس اگر ٹل جائے تو خدا کا کلام باطل ہوتا ہے۔[1]

اسی اشتہار میں دوسری جگہ اس التوا کی حکمت بیان کرتے ہیں:

"قرآن بتلا رہا ہے کہ ایسی پیش گوئیوں کی میعادیں معلق تقدیر کی قسم میں سے ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان کے تبدل اور تغیر کے وجوہ پیدا ہونے کے وقت ضرور وہ تاریخیں اور میعادیں ٹل جاتی ہیں۔ یہی سنت اللہ ہے جس سے قرآن بھرا پڑا ہے پس ہر ایک پیش گوئی جو وحی اور الہام کے ذریعے سے ہوگی، ضرور ہے کہ وہ اسی سنت کے موافق ہو جو خدا تعالیٰ کی کتابوں میں قرار پا چکی ہیں اور اس زمانہ میں اس سے یہ فائدہ بھی متصور ہے کہ جو علوم ربانی دنیا سے اٹھ گئے ہیں پھر ان لوگوں کی ان پر نظر پڑے اور معارف قرآنی کی تجدید ہو جائے۔"[2]

مرزا صاحب کو بہر حال اس پیش گوئی کے صحیح ہونے پر اصرار اور اس کی تکمیل کا یقین تھا۔ انجام آتھم میں لکھتے ہیں:

"میں بار بار کہتا ہوں کہ نفس پیش گوئی داماد احمد بیگ (سلطان محمد)

---

[1] تبلیغ رسالت حصہ سوم صفحہ ۱۱۵ [2] تبلیغ رسالت جلد سوم صفحہ ۱۱۶

کی تقدیر مبرم ہے، اس کی انتظار کرو۔ اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ پیش گوئی پوری نہیں ہوگی اور میری موت آجائے گی"[1]

مرزا سلطان محمد کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں شریک ہوئے اور زخمی ہوتے لیکن بچ گئے اور مرزا صاحب کی وفات کے بعد عرصہ تک زندہ رہے۔

مرزا صاحب نے ۱۹۰۸ء میں وفات پائی اور یہ نکاح جو بقول اُن کے آسمان پر ہو چکا تھا، زمین پر نہ ہو سکا۔ لیکن جماعت کے راسخ العقیدہ افراد کے نزدیک اب بھی اس کے متعلق قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور جب تک نسلِ آدم کا سلسلہ باقی ہے، اس پیشگوئی کے تحقق کا امکان ہے۔ حکیم نور الدین صاحب نے اس کی عجیب تقریر فرمائی۔ وہ اپنے ایک مضمون میں جو وفات مسیح موعود کے عنوان سے ۱۹۰۸ء میں قادیان کے رسالہ "ریویو آف ریلیجنز" میں شائع ہوا تھا لکھتے ہیں :

"اب وہ تمام اہلِ اسلام کو جو قرآن کریم پر ایمان لائے اور لاتے ہیں، ان آیات کا یاد دلانا مفید سمجھ کر لکھتا ہوں کہ جب مخاطبت میں مخاطب کی اولاد اور مخاطب کے جانشین اور اس کے مماثل داخل ہو سکتے ہیں تو احمد بیگ کی لڑکی یا اس لڑکی کی لڑکی کیا داخل نہیں ہو سکتی اور کیا آپ کے علم فرائض میں بنات البنات (لڑکیوں کی لڑکیاں) کو حکم بنات نہیں مل سکتا اور کیا مرزا (صاحب) کی اولاد مرزا (صاحب) کی عصبہ نہیں۔ میں نے تو بارہا عزیز

---

[1] انجام آتھم صفحہ ۳۱ (حاشیہ)

میاں محمود کو کہا کہ اگر حضرت (مرزا صاحب) کی وفات ہو جائے اور یہ لڑکی نکاح میں نہ آوے تو میری عقیدت میں تزلزل نہیں آسکتا۔"[1]

---

[1] ریویو آف ریلیجنز قادیان جلد ۷، نمبر ۶، ۷، ماہ جون و جولائی ۱۹۰۸ء، صفحہ ۲۴۹ (ماخوذ از قادیانی مذہب)

باب چہارم

تحریک قادیانیت کا تنقیدی جائزہ

فصل اوّل

ایک مُستقل مذہب اور ایک مُتوازی اُمّت

ایک غلط فہمی قادیانیت کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ وُہ مسلمانوں کے صدہا دینی و علمی اختلافات اور مکاتب فکر میں سے ایک دینی و علمی اختلافِ رائے اور ایک خاص مکتب فکر ہے اور اس کے پیرو امتِ اسلامیہ کے مذہبی فرقوں اور جماعتوں میں سے ایک مذہبی فرقہ اور جماعت ہیں اور یہ اسلام کی کلامی و فقہی تاریخ کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں۔

لیکن قادیانیت کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنے سے یہ غلط فہمی اور خوش گمانی دور ہو جاتی ہے اور ایک منصف مزاج انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیت ایک مستقل مذہب اور قادیانی ایک مستقل امت ہیں جو دینِ اسلام اور امتِ اسلامیہ کے بالکل متوازی چلتے ہیں اور اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے اس بیان میں کوئی مبالغہ اور غلط بیانی نہیں کہ "حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفاتِ مسیح یا اور چند مسائل میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ غرض کہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک جُز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔"[۱]

اور یہ کہ

"حضرت خلیفہ اوّل نے اعلان کیا تھا کہ ان کا (مسلمانوں کا) اسلام اور ہے اور ہمارا اور ہے۔"[۲]

اسلام کی تاریخ میں اس سے پہلے ایک اور تحریک کی نظیر ملتی ہے جس نے اسلام کا نام لیتے ہوئے اور اپنے دائرۂ عمل کو مسلمانوں کے اندر محدود رکھتے ہوئے اسلام کے نظامِ عقائد و افکار اور نظامِ زندگی کے بالکل متوازی ایک نظامِ اعتقاد و فکر اور ایک نظامِ زندگی کی بنیاد ڈالی اور اسلام کے دائرہ میں "ریاست اندرون ریاست" کی تعمیر کی کوشش کی۔ یہ تحریک باطنیت ہے یا اسماعیلیت جس سے قادیانی تحریک کو حیرت انگیز مماثلت حاصل ہے۔"[۳]

قادیانی تحریک کا متوازی مذہبی نظام

قادیانی تحریک اسلام کے دینی نظام اور زندگی کے ڈھانچے کے مقابلہ میں ایک نیا دینی نظام اور زندگی کا نیا ڈھانچہ پیش کرتی ہے۔ وہ دینی زندگی کے تمام شعبوں اور مطالبوں کی بطور خود خانہ پُری

---

[۱] خطبہ جمعہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب مندرجہ اخبار "الفضل" مورخہ ۳ جولائی ۱۹۳۱ء [۲] ایضاً مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء [۳] ملاحظہ ہو "ہمارا اسماعیلی مذہب اور اس کا نظام" از ڈاکٹر زاہد علی پروفیسر نظام کالج حیدرآباد۔

کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے پیروؤں کو جدید نبوت، جدید مرکز محبت و عقیدت نئی دعوت، نئے روحانی مرکز اور مقدسات، نئے مذہبی شعائر، نئے مقتدا، نئے اکابر، نئی تاریخی شخصیتیں عطا کرتی ہے۔ غرض یہ کہ وہ قلب و دماغ اور فکر و اعتقاد کا نیا مرکز قائم کرتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اس کو ایک فرقہ اور فقہی یا کلامی دبستان یا مکتب خیال سے زیادہ ایک مستقل مذہب اور نظام زندگی کی شکل عطا کرتی ہے۔ اس کے اندر اس بات کا ایک واضح رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ نئی مذہبی بنیادوں پر ایک نئے معاشرے کی تعمیر کرے اور مذہبی زندگی کو ایک نئی شکل اور مستقل وجود بخشے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ جو افراد خلوص اور جوش کے ساتھ اس تحریک و دعوت کو قبول کرتے ہیں اور اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں، ان کے فکر و اعتقاد کا مرکز بدل جاتا ہے اور ان کی زندگی میں قدیم دینی مرکزوں اور اداروں (اپنے وسیع معنی میں) اور شخصیتوں کی جگہ پر جدید دینی مرکز اور اعلیٰ اور شخصیتیں آجاتی ہیں اور وہ ایک نئی امت بن جاتے ہیں جو اپنے جذبات، طریق فکر، عقیدت و محبت میں ایک مستقل شخصیت اور وجود کے مالک ہوتے ہیں۔ انفرادیت اور تقابل کا یہ رجحان قادیانیت کے اندر شروع سے کام کر رہا ہے اور وہ اب بلوغ و پختگی کے اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ قادیانی اصحاب بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ اسلامی شعائر و مقدسات کے ساتھ قادیانی شعائر اور مقدسات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کا ہم پلہ اور مساوی قرار دیتے ہیں۔ صحابۂ کرامؓ کو اسلام کے دینی نظام میں جو مرکز و مقام حاصل ہے، وہ ظاہر ہے۔ لیکن قادیانی اصحاب مرزا صاحب کے رفقاء اور ہم نشینوں کو صحابۂ

رسولؐ ہی کا درجہ دیتے ہیں۔ ایک قادیانی ذمہ دار اس ذہنیت کی اس طرح ترجمانی کرتے ہیں :

> "ان دونوں گروہوں (صحابہ کرام اور رفقائے مرزا غلام احمد صاحب) میں تفریق کرنی یا ایک کو دوسرے سے مجموعی رنگ میں افضل قرار دینا ٹھیک نہیں۔ یہ دونوں فرقے درحقیقت ایک ہی جماعت ہیں، صرف زمانہ کا فرق ہے۔ وہ بعثتِ اولیٰ کے تربیت یافتہ ہیں اور یہ بعثتِ ثانیہ کے۔"[1]

اسی طرح وہ مرزا غلام احمد صاحب کے مدفن کو مرقدِ رسولؐ اور گنبدِ خضراء کا مماثل و شبیہ بتاتے ہیں۔ "الفضل" نے ۱۸ دسمبر ۱۹۲۲ء کی اشاعت میں قادیان کے شعبۂ تربیت کا یہ بیان شائع کیا تھا جس میں ان شرکائے جلسہ کی دینی بے حسی اور بدذوقی کی شکایت کرتے ہوئے جو قادیان حاضر ہونے کے باوجود مرزا صاحب کے مدفن پر حاضری نہیں دیتے کہا گیا ہے :

> "کیا حال ہے اس شخص کا جو قادیان دارالامان میں آئے اور دو قدم چل کر مقبرۂ بہشتی میں حاضر نہ ہوا۔ اس میں وہ روضۂ مطہرہ ہے جس میں اس خدا کے برگزیدہ کا جسمِ مبارک مدفون ہے جسے افضل الرسل نے اپنا سلام بھیجا اور جس کی نسبت حضرت خاتم النبیین نے فرمایا: یُدْفَنُ مَعِیْ فِیْ قَبْرِیْ۔ اس اعتبار سے مدینہ منورہ کے گنبدِ خضراء کے انوار کا پورا

---

[1] الفضل ۲۰ مئی ۱۹۱۸ء

پورا پرتو اس گنبد بیضا پر پڑ رہا ہے اور آپ گویا ان برکات سے حصہ لے سکتے ہیں جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقدِ منور سے مخصوص ہیں، کیا ہی بد قسمت ہے وہ شخص جو احمدیت کے حج اکبر میں اس تمتع سے محروم رہے۔[1]

قادیانی اصحاب اس دینی و روحانی تعلق کی بنا پر جو نئی نبوت اور نئے اسلام کا مرکز ہونے کی بنا پر قادیان کے ساتھ قائم ہوتا ہے، یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ قادیان اسلام کے مقاماتِ مقدسہ میں سے ایک اہم ترین اور عظیم ترین مقام ہے اور وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے ساتھ قادیان کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:

"ہم مدینہ منورہ کی عزت کر کے خانہ کعبہ کی ہتک کرنے والے نہیں ہو جاتے، اسی طرح ہم قادیان کی عزت کر کے مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کی توہین کرنے والے نہیں ہو سکتے۔ خدا تعالیٰ نے ان تینوں مقامات کو مقدس کیا اور ان تینوں مقامات کو اپنی تجلیات کے اظہار کے لیے چنا۔"[2]

خود مرزا غلام احمد صاحب نے قادیان کو سرزمینِ حرم سے تشبیہ و تمثیل دی ہے وہ فرماتے ہیں:

[3] زمینِ قادیاں اب محترم ہے ہجومِ خلق سے ارضِ حرم ہے

---

[1] الفضل جلد ۱۰، نمبر ۴۸ [2] الفضل ۳ ستمبر ۱۹۳۵ء [3] دُرِّثمین صفحہ ۵۲

ان کے نزدیک قادیان کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور مسجد اقصیٰ سے مراد مسیح موعود کی مسجد ہے۔ منارۃ المسیح کے اشتہار (۲۸ مئی ۱۹۰۰ء) میں آپ نے لکھا ہے:

"جیسا کہ سیرِ مکانی کے لحاظ سے خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے بیت المقدس تک پہنچا دیا تھا۔ ایسا ہی سیرِ زمانی کے لحاظ سے آں جناب کو شوکت اسلام کے زمانہ سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تھا، برکات اسلامی کے زمانہ تک جو مسیح موعود کا زمانہ ہے پہنچا دیا، پس اس پہلو کی رُو سے جو اسلام کے انتہائی زمانہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سیرِ کشفی ہے۔ مسجد اقصیٰ سے مراد مسیح موعود کی مسجد ہے جو قادیان میں واقع ہے جس کی نسبت براہینِ احمدیہ میں خدا کا کلام یہ ہے مبارك و مبارك وكل امر مبارك يجعل فيه اور یہ مبارک کا لفظ جو بصیغہ مفعول اور فاعل واقع ہوا۔ قرآن شریف کی آیت بارکنا حولہ کے مطابق ہے۔ پس کچھ شک نہیں جو قرآن شریف میں "قادیان" کا ذکر ہے۔"[1]

ان سب بیانات اور قادیان کے بارے میں اعتقادات کا منطقی اور طبعی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ اس کے لیے شدِّ رحال کر کے سفر کرنے اور وہاں سال بسال حاضر ہونے کو حج ہی کا سا ایک مقدس عمل بلکہ ایک طرح کا حج سمجھا جانے لگے۔ چنانچہ قادیانیت کے رہنماؤں اور ذمہ داروں نے سفرِ قادیان کو ظلی حج کا لقب دیا ہے اور اس کو ان لوگوں کے لیے جو خانۂ کعبہ کے حج کو نہ جا سکیں، حج اسلام کا "حج بدل" قرار دیا ہے۔ مرزا بشیر الدین

---

[1] تذکرہ یعنی مجموعۂ وحی مقدس صفحہ ۳۴۵، ۳۴۶

محمود صاحب نے اپنے ایک خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا :

"چونکہ حج پر وہی لوگ جا سکتے ہیں جو مقدرت رکھتے اور امیر ہوں حالانکہ الٰہی تحریکات پہلے غرباء میں پھیلتی اور پنپتی ہیں اور غرباء کو حج سے شریعت نے معذور رکھا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور ظلی حج مقرر کیا تا وہ قوم جس سے وہ اسلام کی ترقی کا کام لینا چاہتا ہے اور تا وہ غریب یعنی ہندوستان کے مسلمان اس میں شامل ہو سکیں۔" [1]

اس بارے میں اتنا غلو ہونے لگا کہ قادیان کے سفر کو حج بیت اللہ پر ترجیح دی جانے لگی اور یہ اس ذہنیت کا لازمی و فطری نتیجہ ہے کہ قادیانیت ایک زندہ اور جدید مذہب اور اس کا مرکز ایک زندہ اور جدید مذہب کا روحانی مرکز و قبلہ ہے جس سے نئی زندگی اور نئی مذہبی توانائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی بنا پر ایک قادیانی بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ

"جیسے احمدیت کے بغیر پہلا یعنی حضرت مرزا صاحب کو چھوڑ کر جو اسلام باقی رہ جاتا ہے، وہ خشک اسلام ہے۔ اسی طرح اس حج ظلی کو چھوڑ کر مکہ والا حج بھی خشک حج رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں پر آج کل حج کے مقاصد پورے نہیں ہوتے۔" [2]

انفرادیت کا رجحان اور ایک مستقل دین اور نئی تاریخ کے آغاز کا احساس اتنا بڑھ گیا کہ قادیانی حضرات نے اپنی نئی تقویم کی بنیاد ڈال دی اور مسال کے مہینوں کے نئے نام

---

[1] الفضل یکم دسمبر ۱۹۳۲ء [2] پیغام صلح جلد ۲۱ ، نمبر ۲۲

سے تاریخ لکھنے لگے۔ قادیانیت کے سرکاری ترجمان "الفضل" میں مہینوں کے جو نام چھپتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

صلح، تبلیغ، امان، شہادت، ہجرت، احسان، وفا،
ظہور، تبوک، اخاء، نبوت، فتح۔

خالص ہندوستانی مذہب بننے کی حیثیت سے قادیانیت کا خیر مقدم

ان مذہبی تصورات اور انفرادیت کے رجحانات کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب و تحریک قادیانیت کا ذہنی، روحانی و سیاسی مرکز بجائے جزیرۃ العرب اور مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ کے (جو اسلام کا گہوارہ اور اس کی زندگی کا سرچشمہ اور ابدی مرکز ہیں) قادیان بننے لگا جو اس نئے مذہب و تحریک کے ظہور اور نشو و نما کا مرکز ہے۔

اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ قادیانیت اور اس کے پیروؤں کی وابستگی عرب و حجاز سے روز بروز کم ہوتی چلی جائے گی اور اس کی دلچسپیاں اور توجہات ہندوستان میں محدود ہونے لگیں گی جس کی سرزمین سے یہ دعوت و تحریک اٹھی اور جس کی خاک سے اس کا بانی اور داعی پیدا ہوا اور بالآخر اسی میں نشو و نما پا کر اور اپنی زندگی کی منزلیں طے کر کے دفن ہوا۔ یہ اس آغاز اور طریق فکر کا قدرتی نتیجہ ہے جو اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوگا اور جس طرح درخت کے پھل پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ اس تحریک و دعوت کے مزاج اور اس کے طریق کار کے اس منطقی نتیجہ پر بھی تعجب کا کوئی موقع نہیں۔

قادیانیت کے اس مزاج اور اس کے اس رخ کا ہندوستان کے اُن قوم پرستوں

نے پُر جوش خیر مقدم کیا جن کو ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ پُرانی شکایت ہے کہ اُن کی اصلی وابستگی سرزمین حجاز سے ہے اور وُہ ہمیشہ عرب کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس عنصر کے نزدیک ہندوستانی قومیت متحدہ کے لیے یہ بات تشویش اور انتشار کا باعث ہے کہ ملک کی آبادی کا ایک اہم اور کثیر التعداد عنصر ایک بیرونی ملک سے رُوحانی و قلبی تعلق رکھے اور اس کا دینی مرکز، اس کی رُوحانی شخصیتیں، اس کے مقاماتِ مقدسہ اور اس کا عزیز ترین تاریخی سرمایہ ہندوستان کی بجائے کسی اور ملک یا حصۂ زمین میں ہو۔ ہندوستان کے اس قوم پرست عنصر نے قادیانیت کا اس حیثیت سے پُر جوش استقبال کیا ہے کہ وُہ ایک خالص ہندوستانی تحریک ہے اور اس کا روحانی مرکز ہندوستان سے باہر ہونے کی بجائے ہندوستان کے اندر ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کی مشترک قومیت کے نقطۂ نظر سے یہ ایک بڑا مسرت بخش اور اطمینان آفریں رُجحان اور امید کی ایک کرن ہے۔ ایک ہندو اخبار کے ایک ہندو مضمون نگار ڈاکٹر شنکر داس نے بڑی خوبی کے ساتھ اس عنصر کی ترجمانی کی ہے اور اس تبدیلی کو بیان کیا ہے جو احمدیت ایک مسلمان کے ذہنی تعلق میں پیدا کر دیتی ہے۔ انھوں نے اس نکتہ کو سمجھنے میں بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے کہ قادیانیت ایک اسلامی فرقہ نہیں بلکہ ایک مستقل مذہب اور ایک متوازی قوم ہے جو خالص ہندوستانی ہندوؤں میں ایک نئے مذہب اور ایک نئے معاشرہ کی تعمیر کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"سب سے اہم سوال جو اس وقت ملک کے سامنے درپیش ہے

وہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اندر کس طرح قومیت کا جذبہ پیدا کیا جائے کبھی ان کے ساتھ سودے، معاہدے اور پیکیٹ کیے جاتے ہیں۔ کبھی ملک دے کر ساتھ ملانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو ایک الگ قوم تصور کیے بیٹھے ہیں اور وہ دن رات عرب کے ہی گیت گاتے ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ ہندوستان کو بھی عرب کا نام دے دیں۔

اس تاریکی میں، اس مایوسی کے عالم میں ہندوستانی قوم پرستوں اور محبانِ وطن کو ایک ہی امید کی شعاع دکھائی دیتی ہے اور وہ آشا کی جھلک احمدیوں کی تحریک ہے جس قدر مسلمان احمدیت کی طرف راغب ہوں گے وہ قادیان کو اپنا مکہ تصور کرنے لگیں گے اور آخر میں محبِ ہند اور قوم پرست بن جائیں گے۔ مسلمانوں میں احمدیہ تحریک کی ترقی ہی عربی تہذیب اور پان اسلامزم کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ آؤ ہم احمدیہ تحریک کا قومی نگاہ سے مطالعہ کریں۔ پنجاب کی سرزمین میں ایک شخص مرزا غلام احمد قادیانی اٹھتا ہے اور مسلمانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اے مسلمانو! خدا نے قرآن میں جس نبی کے آنے کا ذکر کیا ہے۔ وہ میں ہی ہوں آؤ! میرے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ اگر نہیں آؤ گے تو خدا تمہیں قیامت کے روز نہیں بخشے گا اور تم دوزخی ہو جاؤ گے۔ میں مرزا صاحب کے اس اعلان کی صداقت یا بطالت پر بحث

ذکر کرتے ہوئے صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ مرزائی مسلمان بننے سے مسلمانوں میں کیا تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ ایک مرزائی مسلمان کا عقیدہ ہے کہ

۱. خدا سمے پر لوگوں کی رہبری کے لیے ایک انسان پیدا کرتا ہے، جو اس وقت کا نبی ہوتا ہے۔

۲. خدا نے عرب کے لوگوں میں ان کی اخلاق گراوٹ کے زمانہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجا۔

۳. حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد خدا کو ایک نبی کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس لیے مرزا صاحب کو بھیجا کہ وہ مسلمانوں کی رہنمائی کریں

میرے قوم پرست بھائی سوال کریں گے کہ ان عقیدوں سے ہندوستانی قوم پرستی کا کیا تعلق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایک ہندو کے مسلمان ہو جانے پر اس کی شردھا اور عقیدت رام کرشن، وید، گیتا اور رامائن سے ہٹ کر قرآن اور عرب کی بھومی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی مسلمان احمدی بن جاتا ہے تو اس کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس کی عقیدت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ علاوہ بریں جہاں اس کی خلافت پہلے عرب اور ترکستان (ترکی) میں تھی اب وہ خلافت قادیان میں آجاتی ہے اور مکہ مدینہ اس کے لیے روایتی مقامات مقدسہ رہ جاتے ہیں۔

کوئی بھی احمدی چاہے عرب، ترکستان، ایران یا دنیا کے کسی بھی گوشہ میں بیٹھا ہو، وہ رُوحانی شکتی کے لیے قادیان کی طرف منہ کرتا ہے۔ قادیان کی سرزمین اس کے لیے پنیہ بھومی (سرزمین نجات) ہے اور اسی میں ہندوستان کی فضیلت کا راز پنہاں ہے۔ ہر احمدی کے دل میں ہندوستان کے لیے پریم ہوگا کیونکہ قادیان ہندوستان میں ہے۔ مرزا صاحب بھی ہندوستانی تھے اور اب جتنے خلیفے اس فرقہ کی رہبری کر رہے ہیں، وہ سب ہندوستانی ہیں"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"یہی ایک وجہ ہے کہ مسلمان احمدیہ تحریک کو شکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ احمدیت ہی عربی تہذیب اور اسلام کی دشمن ہے۔ خلافت تحریک میں بھی احمدیوں نے مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا، کیونکہ وہ خلافت کو بجائے ترکی یا عرب میں قائم کرنے کے قادیان میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات عام مسلمانوں کے لیے جو ہر وقت پان اسلامزم و پان عربی شکتی کے خواب دیکھتے ہیں، کتنی ہی مایوس کن ہو مگر ایک قوم پرست کے لیے باعثِ مسرت ہے۔"[1]

---

[1] مضمون ڈاکٹر شنکر داس مہرو بی۔ایس سی۔ایم بی بی ایس مندرجہ اخبار "بندے ماترم" مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۲ء۔ منقول از "قادیانی مذہب" از پروفیسر الیاس برنی۔

فصل دوم

نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت

ختمِ نبوت انعامِ خداوندی اور اُمتِ اسلامیہ کا امتیاز ہے یہ عقیدہ کہ دین مکمل ہو چکا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر اور خاتم النبیین ہیں اور یہ کہ اسلام خدا کا آخری پیغام اور زندگی کا مکمل نظام ہے۔ ایک انعامِ خداوندی اور موہبتِ الٰہی تھا جس کو خدا نے اس اُمت کے ساتھ مخصوص کیا۔ اسی لیے ایک یہودی عالم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس پر بڑے رشک اور حسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ قرآن کی ایک آیت ہے جس کو آپ لوگ پڑھتے رہتے ہیں اگر وہ ہم یہودیوں کی کتاب میں نازل ہوتی اور ہم سے متعلق ہوتی تو ہم اس دن کو جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے، اپنا قومی تہوار اور یومِ جشن بنا لیتے۔ اس کی مراد سورۂ مائدہ کی اسی آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا سے تھی جس میں ختمِ نبوت اور

تکمیلِ نعمت کا اعلان کیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس نعمت کی جلالت عظمت اور اس اعلان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا۔ صرف اتنا فرمایا کہ ہمیں کسی نئے یوم مسرت اور تہوار کی ضرورت نہیں۔ یہ آیت خود ایسے موقع پہ نازل ہوئی ہے جو اسلام میں ایک عظیم الشان اجتماع اور عبادت کا دن ہے۔ اس موقع پہ دو دو عیدیں جمع تھیں، یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) اور روزِ جمعہ۔

ذہنی انتشار سے حفاظت

اس عقیدہ نے اسلام کو انتشار پیدا کرنے والی اور ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والی ان تحریکات اور دعوتوں کا شکار ہونے سے بچایا جو تاریخ اسلام کی طویل مدت اور عالم اسلام کے وسیع رقبہ میں وقتاً فوقتاً سر اٹھاتی رہیں۔ اسی عقیدہ کا فیض تھا کہ اسلام ان مدعیان نبوت اور محرفین اسلام کا بازیچۂ اطفال بننے سے محفوظ رہا جو تاریخ کے مختلف قرنوں اور عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں پیدا ہوتے رہے۔ ختم نبوت کے اسی حصار کے اندر یہ ملت ان مدعیوں کے دستبرد اور یورش سے محفوظ رہی جو اس کے ڈھانچے کو بدل کر ایک نیا ڈھانچہ بنانا چاہتے تھے اور وہ ان تمام سازشوں اور خطرناک حملوں کا مقابلہ کر سکی جن سے کسی پیغمبر کی امت اس سے پہلے محفوظ نہیں رہی اور اتنے طویل عرصہ تک اس کی دینی اور اعتقادی وحدت اور یکسانی قائم رہی۔ اگر یہ عقیدہ اور یہ حصار نہ ہوتا تو یہ امت واحدہ ایسی مختلف اور متعدد امتوں میں تقسیم ہو جاتی۔ جن میں سے ہر امت کا روحانی مرکز الگ ہوتا۔ علمی و تہذیبی سرچشمہ الگ ہوتا۔ ہر ایک کی الگ تاریخ ہوتی

ہر ایک کے الگ اسلاف اور مذہبی پیشوا اور مقتدا ہوتے۔ ہر ایک کا الگ ماضی ہوتا

ختم نبوت کا زندگی اور تمدن پر احسان

عقیدہ ختم نبوت درحقیقت نوع انسانی کے لیے ایک شرف و امتیاز ہے۔ وہ اس بات کا اعلان ہے کہ نوع انسانی سن بلوغ کو پہنچ گئی ہے اور اس میں یہ لیاقت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کو قبول کرے۔ اب انسانی معاشرے کو کسی نئی وحی، کسی نئے آسمانی پیغام کی ضرورت نہیں۔ اس عقیدے سے انسان کے اندر خود اعتمادی کی روح پیدا ہوتی ہے۔ اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا ہے اور اب دنیا کو اس سے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں۔ اب دنیا کو نئی وحی کے لیے آسمان کی طرف دیکھنے کی بجائے خدا کی پیدا کی ہوئی طاقتوں سے فائدہ اٹھانے اور خدا کے نازل کیے ہوئے دین و اخلاق کے بنیادی اصولوں پر زندگی کی تنظیم کے لیے زمین کی طرف اور اپنی طرف دیکھنے کی ضرورت ہے۔ عقیدۂ ختم نبوت انسان کو پیچھے کی طرف لے جانے کے بجائے آگے کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ انسان کے سامنے اپنی طاقتوں کو صرف کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ وہ انسان کو اپنی جدوجہد کا حقیقی میدان اور رخ بتلاتا ہے۔ اگر ختم نبوت کا عقیدہ نہ ہو تو انسان ہمیشہ تذبذب و بے اعتمادی کے عالم میں رہے گا۔ وہ ہمیشہ زمین کی طرف دیکھنے کے بجائے آسمان کی طرف دیکھے گا۔ وہ ہمیشہ اپنے مستقبل کی طرف سے غیر مطمئن اور متشکک رہے گا۔ اس کو ہر مرتبہ ہر نیا شخص یہ بتلائے گا کہ گلشن انسانیت اور روضۂ

آدم ابھی تک نامکمل تھا، اب وہ برگ و بار سے مکمل ہوا ہے[1] اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ جب اس وقت تک یہ نامکمل رہا تو آئندہ کی کیا ضمانت ہے۔ اس طرح وہ بجائے اس کی آبیاری اور اس کے پھلوں اور پھولوں سے متمتع ہونے کے نئے باغبان کا منتظر رہے گا۔ جو اس کو برگ و بار سے مکمل کرے

قادیانیت کی جسارت اور جدت

اسلام کے خلاف وقتاً فوقتاً جو تحریکیں اٹھیں، ان میں قادیانیت کو خاص امتیاز حاصل ہے وہ تحریکیں یا تو اسلام کے نظامِ حکومت کے خلاف تھیں یا شریعتِ اسلامی کے خلاف لیکن قادیانیت درحقیقت نبوتِ محمدی کے خلاف ایک سازش ہے۔ وہ اسلام کی ابدیت اور امت کی وحدت کو چیلنج ہے۔ اس نے ختمِ نبوت سے انکار کرکے اس سرحدی خط کو بھی عبور کر لیا، جو اس امت کو دوسری امتوں سے ممتاز و منفصل کرتا ہے اور جو کسی مملکت کے حدود کو حاضر کرنے کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں جو ہندوستان کے مشہور اخبار اسٹیٹسمین (STATESMAN) میں شائع ہوا تھا۔ بڑی خوبی سے قادیانیت کی اس جسارت اور جدت کو واضح کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

"اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی

---

[1] ملاحظہ ہو مرزا صاحب کا شعر:

روضۂ آدم کہ تھا وہ نامکمل اب تلک　　میرے آنے سے ہوا کامل بجملہ برگ و بار

وحدت، الوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسولِ کریم کی ختمِ رسالت پر ایمان، در اصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہِ امتیاز ہے اور اس امر کے لیے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً برہمو سماج خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسولِ کریم کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں لیکن انھیں ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسولِ کریم کی ختمِ نبوت کو نہیں مانتے جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حدِ فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختمِ نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں، اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسولِ کریم کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا ختمِ نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تاکہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔[۱]

---

[۱] حرفِ اقبال صفحہ ۱۳۶، ۱۳۷۔

ایک دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں:

"مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنا نئی نبوت پر رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"یہ ظاہر ہے کہ اسلام جو تمام جماعتوں کو ایک رسی میں پرونے کا دعویٰ رکھتا ہے ایسی تحریک کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھ سکتا، جو اس کی موجودہ وحدت کے لیے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی سوسائٹی کے لیے مزید افتراق کا باعث بنے" [1]

دعویداران نبوت

مرزا غلام احمد صاحب کی جدوجہد اور تحریک کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ نبوت کی حرمت و عظمت اور اس منصب کی آبرو اور شرف اٹھ جائے۔ انھوں نے نبوت کے اجراء و تسلسل پر جو زور قلم صرف کیا اور اس کی جس طرح تبلیغ و اشاعت کی، انھوں نے الہام کو جو اہمیت دی اور اس پر

---

[1] قادیانی اور جمہور مسلمان" حرف اقبال، صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳۔

جس طرح نبوت کی بنیاد رکھی، اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ نبوت بازیچۂ اطفال بن جائے وہ اگرچہ نبوت کے اجراء و تسلسل کی تقریر محض اپنی نبوت کے امکان و ثبوت کے لیے کرتے ہیں اور ختم نبوت کا انکار محض اپنی حد تک ہے۔ بعد نہ آنے والوں کے لیے وہ اپنے ہی کو خاتم النبیین سمجھتے ہیں۔[1] علامہ اقبال کے بلیغ الفاظ میں :

"خود بانیٔ احمدیت کا استدلال جو قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کے لیے زیبا ہو سکتا ہے یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبر اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کہ پیغمبر اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی، خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے مترادف ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی نہیں، میں آخری نبی ہوں۔ اس امر کے سمجھنے کے بجائے کہ ختم نبوت کا اسلامی تصور نوع انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا تہذیبی قدر رکھتا ہے۔ بانی

---

[1] خطبۂ الہامیہ میں مرزا صاحب فرماتے ہیں: فکان خالیا موضع لبنة اعنی المنعم علیه من هذه العمارة فاراد الله ان یتم النباء ویکمل البناء باللبنة الاخیرة ایها الناظرون (ص)
خود ہی اس کا ترجمہ فرماتے ہیں: "اور اس عمارت میں ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی یعنی منعم علیہم۔ پس خدا نے ارادہ فرمایا کہ اس پیشگوئی کو پورا کرے اور آخری اینٹ کے ساتھ بنا کو کمال تک پہنچا دے۔ پس میں وہی اینٹ ہوں۔"

احمدیت کا خیال ہے کہ ختم نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا، خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو نامکمل پیش کرتا ہے جب میں بانیٔ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعوائے نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیغمبر اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔[۱]

لیکن لوگوں کا ذہن اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آفرینی کی قوت ایک فرد واحد کے لیے مخصوص اور اس کی ذات تک محدود ہو اور نہ اس سے پہلے اس قوت نے اپنا فعل کیا ہو اور نہ اس شخص کے بعد (جو بعثت محمدی کے تیرہ سو سال بعد آیا ہے اور اس کے بعد معلوم نہیں دنیا کو کتنے ہزار سال تک رہنا ہے) فعل کر سکے۔ چنانچہ دوسروں کا ذکر خود مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے لکھا ہے کہ

"خدا تعالیٰ کافروں کی نسبت کہتا ہے ما قدروا اللہ حق قدرہٖ یعنی انھوں نے خدا تعالیٰ کی قدر کو نہیں سمجھا اور یہ سمجھ لیا ہے

---

[۱] پنڈت نہرو کے سوالات کا جواب، حرف اقبال، صفحہ ۱۵۰، ۱۵۱

کہ خدا کے خزانے ختم ہو گئے۔ اس لیے کسی کو کچھ دے نہیں سکتا۔ اسی طرح یہ کہتے ہیں کہ خواہ کتنا ہی زہد اور اتقا میں بڑھ جاتے پرہیزگاری اور تقویٰ میں کئی نبیوں سے آگے گزر جاتے۔ معرفت الٰہی کتنی ہی حاصل کرے لیکن خدا اس کو کبھی نبی نہیں بنائے گا اور کبھی نہیں بنائے گا۔ ان کا یہ سمجھنا خدا تعالیٰ کی قدر کو ہی نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے ورنہ ایک نبی کیا میں تو کہتا ہوں ہزاروں نبی ہوں گے۔"[1]

چنانچہ مرزا غلام احمد صاحب کے بعد لوگوں کو نبوت کا دعویٰ کرنے کی عام جرأت ہو گئی۔ ہم کو کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں جو خاص حد تک تفصیل کے ساتھ محفوظ ہے۔ اکبر کے سوا کسی شخصیت کا علم نہیں جس نے ختم نبوت کے انکار اور دینِ جدید کے ظہور کی جسارت کی ہو۔ اکبر نے بھی اس منظم اور واضح طریقہ پر جدید نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ لیکن مرزا صاحب کے بعد یہ دروازہ عمومی طور پر کھل گیا۔ پروفیسر الیاس برنی صاحب نے ۱۳۵۱ھ تک سات مدعیانِ نبوت کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر زیادہ اہتمام سے ان مدعیانِ نبوت کی "مردم شماری" ہو تو صرف پنجاب میں اس سے بہت زیادہ تعداد ثابت ہو گی۔ ان مدعیانِ نبوت کی کثرت اور خام خیالی پر خود مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے احتجاج فرمایا۔ انھوں نے ایک تقریر میں فرمایا:

"دیکھو ہماری جماعت میں ہی کتنے مدعی نبوت کھڑے ہو گئے تھے

[1] انوارِ خلافت صفحہ ۶۲

ان میں سے سوائے ایک کے سب کے متعلق یہ خیال رکھتا ہوں کہ وہ اپنے نزدیک جھوٹ نہیں بولتے۔ واقعہ میں ابتدا میں انھیں الہام ہوتے اور کوئی تعجب نہیں اب بھی ہوتے ہوں مگر نقص یہ ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے الہاموں کو سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔ ان میں سے بعض سے مجھے ذاتی واقفیت ہے اور میں گواہی دے سکتا ہوں کہ ان میں اخلاص پایا جاتا تھا، خشیت اللہ پائی جاتی تھی۔ آگے خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ میرا یہ خیال کہاں تک درست ہے۔ مگر ابتدا میں ان کی حالت مخلصانہ تھی۔ ان کے الہاموں کا ایک حصہ خدائی الہاموں کا تھا، مگر نقص یہ ہو گیا کہ انھوں نے الہاموں کی حکمت کو نہ سمجھا اور ٹھوکر کھا گئے۔"[1]

تفریق بین المسلمین

ان جدید نبوتوں" سے عالم اسلام میں جو زبردست انتشار مسلمانوں میں جو عظیم الشان تفریق اور امتِ واحدہ کی جو افسوسناک تقسیم ہوگی۔ اس کے تصور سے بھی ایک مسلمان کو وحشت ہوتی ہے۔ لادینیت اور مذہب بیزاری کے اس دور میں خود بخود لوگوں میں "انا الحق" اور "انا النبی" کہنے کا ذوق نہیں رہا۔ لیکن مرزا غلام احمد صاحب کے لٹریچر کے اثر اور شبک سر قادیانی مبلغین کی تبلیغ سے اگر آج عالم اسلامی میں نبوت کے دعوے کا ذوق پیدا ہو جائے اور عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں مختلف اشخاص اپنا اپنا علمِ نبوت بلند کر دیں اور جو اس علم کے نیچے نہ آئے، نبوت کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان کی تکفیر شروع کر دیں تو عالم

---

[1] الفضل یکم جنوری ۱۹۳۵ء

اسلام میں کیسا ذہنی اور دینی انتشار اور تصادم پیدا ہوگا اور کس طرح عالمِ اسلام مختلف دینی محاذوں میں تقسیم ہو جائے گا اور جو امت رنگ و نسل اور قوم و وطن کی تفریق مٹانے اور ساری نوعِ انسانی کو ایک دوسرے کا بھائی اور ہمدرد بنانے آئی ہے وہ کس طرح دینی تعصبات اور باہمی تفریق و تکفیر کا شکار ہو کر رہ جائے گی اس خطرہ کو مولوی محمد علی صاحب لاہوری نے بھی محسوس کیا اور بڑی خوبی اور قوت کے ساتھ اپنے ایک مضمون میں اس کا اظہار کیا ہے لیکن انھوں نے غور نہیں کیا کہ اس خطرہ کا دروازہ مرزا غلام احمد صاحب نے کھولا ہے اور اسلام کی پوری تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نبوت کے اجراء و تسلسل کو ایک دعوت اور تحریک کے طور پر پیش کیا ہے۔ مولوی محمد علی صاحب اہلِ بصیرت کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خدارا غور کرو کہ اگر یہ عقیدہ میاں صاحب کا درست ہے کہ نبی آتے رہیں گے اور ہزاروں نبی آئیں گے[1] جیسا کہ انھوں نے بالصراحت "انوارِ خلافت" میں لکھ دیا ہے تو یہ ہزاروں گروہ ایک دوسرے کو کافر کہنے والے ہوں گے یا نہیں اور اسلامی وحدت کہاں ہوگی؟ یہ بھی مان لو کہ وہ سارے نبی احمدی جماعت میں ہی ہوں گے پھر احمدی جماعت کے کتنے ٹکڑے ہوں گے۔ آخر گزشتہ ملتوں سے تم

---

[1] میاں صاحب اس عقیدہ کے مصنف یا موجد نہیں ہیں انھوں نے تو صرف مرزا صاحب کی ترجمانی کی ہے۔

اتنے ناواقف نہیں ہو کہ کس طرح نبی کے آنے پر ایک گروہ اس کے ساتھ اور ایک خلاف ہو جاتا ہے۔ وہ خدا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر کُل دُنیا کی قوموں کو ایک کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکا ہے کیا اب وہ مسلمانوں کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا کہ ایک دُوسرے کو کافر کہہ رہے ہوں اور آپس میں کوئی تعلقات اخوتِ اسلامی کے نہ رہ گئے ہوں۔ یاد رکھو اگر اسلام کو کُل ادیان پر غالب کرنے کا وعدہ سچا ہے تو یہ مصیبت کا دن اسلام پر کبھی نہیں آسکتا کہ ہزاروں نبی اپنی اپنی ٹولیاں علیٰحدہ علیٰحدہ لیے پھرتے ہوں اور ہزارہا ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں ہوں جن کے پجاری اپنی اپنی جگہ ایمان اور نجات کے ٹھیکدار بنے ہُوئے ہوں اور دُوسرے تمام مسلمانوں کو کافر بے ایمان قرار دے رہے ہوں[له]۔"

ایک غلط اور خطرناک مفروضہ

مرزا غلام احمد صاحب کا ایک مفروضہ جس نے اسلامی ذہن کے لیے بے چینی اور اسلامی معاشرہ کے لیے انتشار کا ایک مستقل دروازہ کھول دیا ہے، یہ ہے کہ وہ "مکالمات و مخاطباتِ الٰہیہ" کو مذہب کی صداقت کی شرط اور اتباع اور مجاہدات کا قدرتی نتیجہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جس مذہب میں مکالمات و مخاطباتِ الٰہیہ کا سلسلہ جاری نہ

له ردِّ تکفیر اہلِ قبلہ صفحہ ۴۹، ۵۰۔

اسلام میں کیسا ذہنی اور دینی انتشار اور تصادم پیدا ہوگا اور کس طرح عالم اسلام مختلف دینی محاذوں میں تقسیم ہو جائے گا اور جو امت رنگ و نسل اور قوم و وطن کی تفریق مٹانے اور ساری نوع انسانی کو ایک دوسرے کا بھائی اور ہمدرد بنانے آئی ہے وہ کس طرح دینی تعصبات اور باہمی تفریق و تکفیر کا شکار ہو کر رہ جائے گی اس خطرہ کو مولوی محمد علی صاحب لاہوری نے بھی محسوس کیا اور بڑی خوبی اور قوت کے ساتھ اپنے ایک مضمون میں اس کا اظہار کیا ہے لیکن انھوں نے غور نہیں کیا کہ اس خطرہ کا دروازہ مرزا غلام احمد صاحب نے کھولا ہے اور اسلام کی پوری تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نبوت کے اجراء و تسلسل کو ایک دعوت اور تحریک کے طور پر پیش کیا ہے۔ مولوی محمد علی صاحب اہل بصیرت کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خدا را غور کرو کہ اگر یہ عقیدہ میاں صاحب کا درست ہے کہ نبی آتے رہیں گے اور ہزاروں نبی آئیں گے[1]، جیسا کہ انھوں نے بالصراحت "انوار خلافت" میں لکھ دیا ہے تو یہ ہزاروں گروہ ایک دوسرے کو کافر کہنے والے ہوں گے یا نہیں اور اسلامی وحدت کہاں ہوگی؟ یہ بھی مان لو کہ وہ سارے نبی احمدی جماعت میں ہی ہوں گے پھر احمدی جماعت کے کتنے ٹکڑے ہوں گے۔ آخر گزشتہ سنتوں سے تم

---

[1] میاں صاحب اس عقیدہ کے مصنف یا موجد نہیں ہیں انھوں نے تو صرف مرزا صاحب کی ترجمانی کی ہے۔

اتنے ناواقف نہیں ہو کہ کس طرح نبی کے آنے پر ایک گروہ اس کے ساتھ اور ایک خلاف ہو جاتا ہے۔ وہ خدا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر کل دنیا کی قوموں کو ایک کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکا ہے کیا اب وہ مسلمانوں کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا کہ ایک دوسرے کو کافر کر رہے ہوں اور آپس میں کوئی تعلقات اخوت اسلامی کے نہ رہ گئے ہوں۔ یاد رکھو اگر اسلام کو کل ادیان پر غالب کرنے کا وعدہ سچا ہے تو یہ مصیبت کا دن اسلام پر کبھی نہیں آسکتا کہ ہزاروں نبی اپنی اپنی ٹولیاں علیحدہ علیحدہ لیے پھرتے ہوں اور ہزاروں ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں ہوں جن کے پجاری اپنی اپنی جگہ ایمان اور نجات کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہوں اور دوسرے تمام مسلمانوں کو کافر بے ایمان قرار دے رہے ہوں[1]۔"

ایک غلط اور خطرناک مفروضہ

مرزا غلام احمد صاحب کا ایک مفروضہ جس نے اسلامی ذہن کے لیے بے چینی اور اسلامی معاشرہ کے لیے انتشار کا ایک مستقل دروازہ کھول دیا ہے، یہ ہے کہ وہ "مکالمات و مخاطبات الٰہیہ" کو مذہب کی صداقت کی شرط اور اتباع اور مجاہدات کا قدرتی نتیجہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جس مذہب میں مکالمات و مخاطباتِ الٰہیہ کا سلسلہ جاری نہ

---

[1] ردِّ تکفیر اہلِ قبلہ صفحہ ۴۹ ، ۵۰

ہو وہ مذہب مُردہ اور باطل ہے بلکہ شیطانی مذہب ہے اور جہنّم کی طرف لے جاتا ہے اور جس مذہب کے پیرو زہد و مجاہدہ کے باوجود اس دولت سے سرفراز نہ ہوں وہ گمراہ محروم اور نابینا ہیں۔

وُہ براہینِ احمدیہ کی جلد پنجم میں لکھتے ہیں:

"ایسا نبی کیا عزت اور کیا مرتبت اور کیا تاثیر اور کیا قوتِ قدسیہ اپنی ذات میں رکھتا ہے جس کی پیروی کے دعوے کرنے والے صرف اندھے اور نابینا ہوں اور خدا تعالیٰ اپنے مکالمات و مخاطبات سے ان کی آنکھیں نہ کھولے۔ یہ کس قدر لغو اور باطل عقیدہ ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وحی الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے اور آئندہ کو قیامت تک اس کی کوئی بھی اُمید نہیں۔ صرف قصّوں کی پُوجا کرو۔ پس کیا ایسا مذہب کچھ مذہب ہو سکتا ہے جس میں براہِ راست خدا تعالیٰ کا کچھ بھی پتہ نہیں لگتا جو کچھ ہیں، قصّے ہیں اور کوئی اگرچہ اس کی راہ میں اپنی جان بھی فدا کرے، اس کی رضا جوئی میں فنا ہو جائے اور ہر ایک چیز پر اس کو اختیار کرے تب بھی وہ اس پر اپنی شناخت کا دروازہ نہیں کھولتا اور مکالمات اور مخاطبات سے اس کو مشرف نہیں کرتا۔

مَیں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں مجھ سے

زیادہ بیزار ایسے مذہب سے اور کوئی نہ ہوگا۔ میں ایسے مذہب کا نام شیطانی مذہب رکھتا ہوں نہ کہ رحمانی اور میں یقین رکھتا ہوں کہ ایسا مذہب جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔[1]

مکالمات کو شرط قرار دینے کے نتائج

مرزا صاحب نے "مکالمات و مخاطبات الٰہیہ" کو معرفت و نجات اور صداقت و حقانیت کی شرط قرار دے کر اس مذہب کو جس کو اللہ تعالیٰ نے سہل اور ہر شخص کے لیے قابلِ عمل قرار دیا تھا، نہایت مشکل اور نہایت محدود بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۲۳)	اللہ تمہارے اوپر آسانی چاہتا ہے دشواری نہیں چاہتا۔
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج ۰ ع ۱۰)	اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل
لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ع ۴۰)	خدا تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے۔

لیکن اگر معرفت و نجات کے لیے مکالمات و مخاطبات الٰہیہ شرط ہیں تو اس دین سے زیادہ دشوار چیز کوئی نہیں اس لیے کہ بکثرت لوگ اس مکالمہ و الہام سے فطرۃً مناسبت نہیں رکھتے اور خواہ وہ کیسے ہی مجاہدات کریں۔ مکالمہ و الہام کا

---

[1] براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۸۳۔

دروازہ ان پر نہیں کھلتا۔ بہت سے لوگ اس سے فطری مناسبت رکھتے ہیں مگر ان کو ان مجاہدات کی (جو مکالمہ اور مخاطبت الٰہیہ کے لیے شرط ہیں) فرصت یا توفیق نہیں۔ وہ عالمگیر مذہب جو ساری انسانیت کی فلاح کے لیے آیا ہے اور سب کو خدا کے دین کی دعوت دیتا ہے معرفت و نجات اور مغفرت و رضا اور وصول الی اللہ کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں لگا سکتا جس کو کروڑوں انسانوں میں سے چند پورا کر سکیں۔

پھر قرآن مجید میں مومنین اور فلاح یافتہ انسانوں کی صفات ملاحظہ ہوں، سورۃ المؤمنون کا پہلا رکوع پڑھیے، قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ الخ سورۃ الفرقان کا آخری رکوع پڑھیے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا الخ اور خود پہلی سورت کی پہلی آیت پڑھیے:

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

اس کتاب میں کچھ شک نہیں، راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو، جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، اور جو ہم نے روزی دی ہے ان کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

(البقرہ ع ۱)

اس میں کہیں بھی مکالمۂ الٰہی کو ہدایت و فلاح کی شرط قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس کے برعکس ایمان بالغیب کو ہدایت کی پہلی شرط قرار دیا گیا ہے اور ایمان بالغیب

کا مفہوم ہی یہ ہے کہ نبی کے اعتماد پر (جس کو اللہ تعالیٰ اجتبائی طور پر مکالمۂ الٰہی کے لیے انتخاب فرماتا ہے) غیبی حقائق پر جو تنہا عقل اور حواس ظاہری کی مدد سے معلوم نہیں کیے جا سکتے تسلیم کیا جائے۔ اگر مرزا صاحب کا ارشاد تسلیم کر لیا جائے کہ مکالمۂ الٰہی معرفت اور نجات کے لیے شرط ہے تو ایمان بالغیب کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور اس پر قرآن مجید کا اصرار سمجھ میں نہیں آتا۔

پھر یہ صحابۂ کرامؓ کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کتنے مکالمات و مخاطباتِ الٰہیہ سے سرفراز تھے؟ اور حدیث و تاریخ سے کتنوں کے متعلق ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان کو مکالمہ و مخاطبہ حاصل تھا؟ کوئی شخص جو اس دور کی تاریخ اور اس جماعت کے مزاج و حالات بلکہ انسانی طبائع و نفسیات سے واقف ہے، اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ایک لاکھ افراد سے متجاوز اس قدسی جماعت کو مکالمہ و مخاطبۂ خداوندی حاصل تھا اور جب صحابۂ کرامؓ کا یہ حال تھا تو بعد کے لوگوں کا کیا ذکر؟

سلسلۂ نبوت کے انکار کی رُوح

مکالمات و مخاطباتِ الٰہیہ کی یہ اہمیت اور عمومیت درحقیقت نبوت کے خلاف در پردہ بغاوت اور ایک مخفی سازش ہے۔ مکالمات و مخاطبات کے اس عموم و تسلسل کے بعد عقلاً و عملاً سلسلۂ انبیاءؑ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآن مجید اور تمام آسمانی کتابوں نے انسانوں کی ہدایت اور معرفتِ الٰہی کے حصول، ذات و صفات اور منشاء

خداوندی کی شناخت اور حقائقِ غیبی کے علم کو سلسلۂ نبوت سے وابستہ اور مربوط کیا ہے۔ قرآن ہدایت یافتہ مومنین کی زبان سے کہتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ (الاعراف ع ۵)

شکر اس اللہ کا جس نے ہم کو یہاں تک پہنچا دیا اور ہم نہ تھے راہ پانے والے اگر نہ ہدایت کرتا ہم کو اللہ۔ بے شک لائے رسول ہمارے رب کی سچی بات۔

دوسری جگہ ذات و صفات کے بارے میں مشرکانہ و جاہلانہ خیالات و عقائد کی تردید کرتے ہوئے ارشاد ہے:

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۚ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ۚ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ (الصّٰفّٰت، ع ۵)

پاک ذات ہے تیرے رب کی، وہ پروردگار عزت والا پاک ہے، ان باتوں سے جو بیان کرتے ہیں اور سلام ہے رسولوں پر، اور سب خوبی اللہ کو جو رب ہے سارے جہان کا۔

بعثتِ انبیاءؑ کی حکمت و مصلحت بتلاتے ہوئے فرماتا ہے:

لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ (النساء ع ۲۳)

تاکہ لوگوں کے لیے اللہ پر الزام کا موقع نہ رہے۔

مرزا غلام احمد صاحب کے فلسفۂ تسلسل و بقائے وحی اور مکالمات و مخاطبات الٰہیہ کے عموم و لزوم پر اگر دقتِ نظر سے غور کیا جائے اور اس کی علمی تحلیل و تجزیہ کیا

جائے تو اس میں ختمِ نبوت کے بجائے سلسلۂ نبوت کے انکار کی رُوح نظر آئے گی اور ہدایت و معرفتِ الٰہی بھی مسمریزم اور جدید تحریکِ استحضارِ ارواح (Spiritualism) وغیرہ کی طرح ایک روحانی تجربہ اور عمل بن کر رہ جائے گی۔

مکالمات کے سرچشمہ کا تعین

پھر ان مکالمات و مخاطبات الٰہی کی تنقید کا کیا معیار ہے؟ اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ انسان جو کچھ سُن رہا ہے وُہ خود اس کے باطن کی آواز یا اس کے ماحول اور تربیت کی صدائے بازگشت یا اس کی اندرونی خواہشات اور سوسائٹی کے اثرات کا نتیجہ نہیں؟ جن لوگوں نے مکاشفات و مکالمات کے قدیم مجموعے دیکھے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ ان کا کتنا بڑا حصّہ ان غلط مفروضات و نظریات کی تصدیق اور تبلیغ کرتا تھا، جو قدیم علم الاصنام (Mythology) نے پیدا کر دیے تھے مصری فلاطونیت جدیدہ (Neo-Platonism) کے رُوحانی مشاہدات اور ربانی مکالمات ملاحظہ ہوں! کیا ان کے مکاشفات اور مکالمات نے اس وقت کے صنمیات اور فلسفیانہ مفروضات کی تصدیق نہیں کی؟ خود اسلامی دَور میں بعض اہلِ مکاشفہ و مکالمہ، عقلِ اوّل سے مصافحہ کرنا اور اس سے ہم کلام ہونا بیان کرتے ہیں جو محض فلسفۂ قدیم بلکہ یونانی علم الاصنام کا ایک ذہنی تخیل تھا۔ خود مرزا صاحب کے مکالمات و مخاطبات میں کتنا بڑا حصّہ ان کے زمانہ، ماحول اور تربیت کے تحت الشعور اثرات کا نتیجہ اور اس انحطاط پذیر اور مائل بہ زوال معاشرے کا عکس معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے نشو و نما پایا اور جس

میں وہ اپنی وحدت سے کر کھڑے ہوتے بلکہ کتنا بڑا حصہ وہ ہے جس کے متعلق ایک مبصر کو جو ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے واقف ہے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا سرچشمہ عالم غیب کے بجائے ہندوستان کا سیاسی اقتدارِ اعلیٰ ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے جو فلسفہ کے بھی ایک عظیم فاضل ہیں اور انھوں نے مرزا صاحب کی تحریک اور ان کے مکالمات و الہامات کا بھی نظرِ غائر سے مطالعہ کیا ہے اس حقیقت کو اپنے مخصوص علمی انداز میں خوب واضح کیا ہے۔ اس مضمون میں جو انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے بعض شبہات و سوالات کے جواب میں لکھا تھا، فرماتے ہیں:

"میں یہ ضرور کہوں گا کہ بانیٔ احمدیت نے ایک آواز سُنی، لیکن اس امر کا تصفیہ کہ یہ آواز اُس خدا کی طرف سے تھی جس کے ہاتھ میں زندگی اور طاقت ہے یا لوگوں کے روحانی افلاس سے پیدا ہوئی اس تحریک کی نوعیت پر منحصر ہونا چاہیے جو اس آواز کی آفریدہ ہے اور ان افکار و جذبات پر بھی جو اس آواز نے اپنے سننے والوں میں پیدا کیے ہیں۔ قارئین یہ نہ سمجھیں کہ میں استعارات استعمال کر رہا ہوں اقوام کی تاریخِ حیات بتلاتی ہے کہ جب کسی قوم کی زندگی میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط ہی الہام کا ماخذ بن جاتا ہے اور اس قوم کے شعراء، فلاسفہ، صوفیہ، مُدبّرین اس سے متاثر ہو جاتے ہیں

اور مبلغین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آجاتی ہے جس کا مقصد واحد یہ ہوتا ہے کہ منطق کی سحر آفریں قوتوں سے اس قوم کی زندگی کے ہر اُس پہلو کی تعریف و تحسین کرے جو نہایت ذلیل و قبیح ہوتا ہے۔ یہ مبلغین غیر شعوری طور پر مایوسی کو اُمید کے درخشاں لباس میں چھپا دیتے ہیں کردار کے روایتی اقتدار کی بیخ کنی کرتے ہیں اور اس طرح ان لوگوں کی روحانی قوت کو گھٹا دیتے ہیں جو ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی قوت ارادی پر خدا مخود کر دہ جنھیں الہام کی بنیاد پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے، زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ [1]

---

[1] حرف اقبال صفحہ ۱۵۷ ، ۱۵۸

فصل سوم

قادیانیت کی لاہوری شاخ اور اُس کا عقیدہ اور تفسیر

مولوی محمد علی صاحب اور لاہوری شاخ کا موقف اور عقیدہ

قادیانیت کی اس شاخ نے جس کا مرکز قادیان اور اب ربوہ ہے اور جس کی قیادت مرزا غلام احمد صاحب کے فرزند اکبر مرزا بشیر الدین محمود صاحب کرتے ہیں۔ مرزا غلام احمد صاحب کی نبوت کے عقیدہ کو اپنی جماعت کی اساس بنایا ہے۔ وہ پوری وضاحت اور استقامت کے ساتھ اس عقیدہ پہ قائم ہے۔ اس عقیدہ پر علمی و اسلامی نقطۂ نظر سے جو تنقید کی جائے اور اس کو اسلام سے جس قدر بعید اور اس کے لیے خطرناک سمجھا جائے وہ درست ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس شاخ نے ایک واضح اور قطعی موقف اختیار کیا ہے اور اپنی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ مرزا صاحب کے منشا کی صحیح ترجمانی و نمائندگی اور اُن کی تعلیمات و تصریحات کی محض صدائے بازگشت ہے۔

لیکن لاہوری شاخ کا موقف (جس کی قیادت مولوی محمد علی صاحب کرتے

ہیں) بڑا عجیب اور ناقابلِ فہم ہے۔ مرزا صاحب کی تصنیفات اور تحریروں کا مطالعہ کرنے والا قطعی اور بدیہی طور پر دیکھتا ہے کہ وہ صاف صاف نبوّت کے مدعی ہیں اور جو اس پر ایمان نہ لائے، اس کی تکفیر کرتے ہیں۔ اگر الفاظ کے معنی متعین ہیں اور لغت اور اہلِ زبان کا قول اس بارے میں قولِ فیصل ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ مرزا صاحب نے یہ کتابیں ملک کی زبان میں افادۂ عام کے لیے لکھی ہیں تو اس میں شبہ باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنی کتابوں میں پکار پکار کر کہ رہے ہیں کہ میں نبی ہوں، صاحبِ وحی ہوں، صاحبِ امر و نہی اور صاحبِ شریعت ہوں۔ میرا منکر کافر اور جہنمی ہے لیکن مولوی محمد علی صاحب مرزا صاحب کے خود ان کی ذات اور ان کی اولاد سے زیادہ ہمدرد ہیں۔ وہ اپنے عقیدہ میں ان کی عظمت اور ان کے دینی کارناموں اور خدمات کی آبرو کو بچانا چاہتے ہیں اور دراصل شعوری اور غیر شعوری طریقہ پر اپنے قلبی تعلق اور دینی عقیدت کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور اپنی رُوح اور دینی شعور کو اس صدمہ کی تکلیف سے بچانا چاہتے ہیں جو ان کے نبوّت کے دعوے اور عام مسلمین کی تکفیر سے پہنچتی ہے۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ مرزا صاحب نے کہیں اصطلاحی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں جہاں جہاں نبوت، وحی، کفر وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ محض صوفیانہ اصطلاحات اور مجازات و استعارات ہیں۔ ظاہر ہے کہ معروف و مروج الفاظ اور مشہور دینی اصطلاحات کو تصوف کا رمز اور مجاز و استعارہ ثابت کرنے کے بعد

ہر مصنف اور ہر داعی کی تقریر و تحریر کی ہر طرح کی تاویل و توجیہ ہو سکتی ہے اور پھر کسی چیز کا بھی ثبوت ممکن نہیں۔

مولوی محمد علی صاحب مرزا صاحب کو چودھویں صدی کا مجدد اعظم اور نصِ اکبر اور اس سے بڑھ کر مسیح موعود مانتے ہیں اور اس نقطہ پر دونوں شاخوں کا اجتماع ہو جاتا ہے۔ ان کی تفسیر میں مرزا صاحب کے مسیح موعود ہونے کے ارشادات موجود ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیت وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو کافۃ الناس کی طرف مبعوث ہو گئے اور جن کا زمانۂ نبوت قیامت تک ممتد ہے کبھی دوسرے رسول یا نبی کا محتاج اپنے آپ کو سمجھنا اس نعمت عظمیٰ کی ناشکرگزاری ہے۔ پس حدیث میں جو ابن مریم کے آنے کی پیش گوئی ہے اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اس امت میں سے کوئی شخص ابن مریم کے رنگ میں آجائے۔ جس طرح الیاس کے دوبارہ آنے کی پیشگوئی یوں پوری ہوئی کہ حضرت یحییٰ الیاس کے رنگ میں آگئے۔ حضرت عیسیٰ کو قرآن کریم کی یہ تصریح امت محمدیہ میں آنے سے روکتی ہے"[1]

انھوں نے اپنی تصنیفات میں عام طور پر مرزا صاحب کے لیے مسیح موعود

---

[1] تفسیر بیان القرآن، حصہ اول صفحہ ۳۱۷

کا لقب استعمال کیا ہے۔[1] ہمیں یہاں پر اُن کے اس عقیدہ کے بجائے ان کی تفسیر پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس سے کس رُجحان کا پتہ چلتا ہے اور وُہ کس طرح کا دینی ذہن اور دینی فہم پیدا کر سکتی ہے۔

تفسیر بیانُ القرآن

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی محمّد علی صاحب لاہوری کے ذہن نے سر سید کے لٹریچر اور اُن کی تفسیرِ قرآن کے اُسلوب اور اُن کے فکر کو پُورے طور پر جذب کر لیا تھا۔ مولوی نورالدین صاحب کے درسِ تفسیر اور صحبت نے اس رُجحان اور ذوق کو مزید تقویت اور غذا پہنچائی۔ وُہ اس طبقہ اور گروہ کے بہترین نمائندہ ہیں جن کو اسلام کے تعلق اور عصرِ جدید کے سامنے قرآن پیش کرنے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی اشاعت کا شوق ہے لیکن اُس کی ذہنی ساخت اور اُس کی گذشتہ تعلیم و تربیت غیبی حقائق اور ماورائے عقل واقعات کو قبول کرنے سے بالکل قاصر ہے۔ اس نے سائنس اور علومِ جدیدہ کی تحقیقات یا (صحیح تر الفاظ میں) مشہور نظریات و مسائل کو مسلّمات و بدیہیات کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اور اُن کو کسی چیز کے (خواہ وُہ مذہب کی تعلیمات اور صُحفِ سماوی کے مضامین ہوں) ردّ و قبول کے لیے معیار و میزان سمجھ لیا ہے اس کا ذہن اور اس کی ثقافت حقیقۃً عالمِ غیب اور معجزات و خوارق کو تسلیم کرنے سے ابا کرتی ہے لیکن وُہ اپنے نسلی یا دینی لگاؤ کی وجہ سے قرآنِ مجید اور اسلام

---

[1] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ختم النبوۃ فی الاسلام اور ردّ تکفیر اہلِ قبلہ ملاحظہ ہوں۔

کے نصوص سے بھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس نے درمیان کی راہ یہ نکالی ہے کہ ان حقائقِ غیبی اور معجزات و مافوق الفطرۃ واقعات کی تشریح اس طرح کی جائے کہ جدید نظریات و مسلمات سے وہ متصادم نہ ہوں اور ان کے تسلیم کرنے میں ذہن پر غیر ضروری بار نہ پڑے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ آیات قرآنی کی تفسیر اور تاویل میں ہر طرح کا تکلف اور ہر طرح کی موشگافی کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اور ہر کمزور سے کمزور چیز کا سہارا لینے سے بھی اس کو عذر نہیں۔ وہ اپنی ان تشریحات اور تاویلات میں اصولِ تفسیر، زبان و ادب کے قواعد، عرف و استعمال، قدیم کلام کی سند و حجت۔ قرآن کے مخاطبینِ اولین اور اہلِ زبان کے فہم، متقدمین کی تفاسیر، غرض ہر اس چیز سے جو اس راہ میں حارج اور قرآن مجید اور فہم جدید کی تطبیق میں خلل انداز ہو دستبردار ہونے کے لیے تیار ہے۔ سرسید مرحوم کی تفسیر کا ضخیم دفتر اور مولوی محمد علی لاہوری کے تفسیری نوٹس اور حواشی اس طرز تفسیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے اپنی قوم بنی اسرائیل کے لیے (جو ایک بے آب دشت میں پڑ گئی تھی) پانی مانگا تو ارشاد ہوا کہ اپنا عصا چٹان پر مارو، چنانچہ اس عمل سے قدرتِ الٰہی سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبائل نے آسودہ ہو کر اپنی پیاس بجھائی۔

وَ إِذِ اسْتَسْقٰى مُوسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۚ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ

(البقرہ ۶۰)

آیات کی اس تفسیر کی رُو سے جو عربی کے الفاظ سے سمجھ میں آتی ہے اور آج تک عہدِ رسالت سے اس وقت تک کی جاتی رہی ہے ۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے چٹان سے پانی کے چشمے مافوق الفطرۃ اور خارقِ عادت طریقہ پر جاری ہوئے یہ بات چونکہ روزمرہ کے مشاہدہ اور طبعیات و علمِ طبقات الارض کے عام قوانین سے الگ ہے ۔ اس لیے اس ظاہری معنے کو چھوڑ کر مولوی محمد علی صاحب نے ضرب اور عصا کے وہ معنی بیان کیے ہیں جو کلامِ عرب میں خاص ترکیب اور خاص محاورات میں بطور مجاز و استعارہ کے مراد لیے جاتے ہیں یعنی ضرب فی الارض کے معنی زمین میں چلنا ۔ عصا کے معنی اجتماع و ائتلاف اور جماعت اور پھر الفاظ کے ان مجازی معنی کی مدد سے آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ " اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چلے جاؤ اور اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو کسی پہاڑ پر چلے جانے کی ہدایت فرمائی جہاں ان کو بارہ چشمے مل گئے ۔[1] یہ سب تکلفات انھوں نے اس لیے گوارا کیے کہ اس معجزہ اور خارقِ عادت واقعہ کے ماننے اور اس کا ثبوت پیش کرنے سے وہ بچ جائیں اور اُن کے قارئین کے ذہن پر ایمان بالغیب اور تصدیقِ معجزات کا بوجھ نہ پڑے ۔

---

[1] بیان القرآن ، جلد اوّل ، صفحہ ۶۹ ۔

۲۔ اسی سورہ کی آیت ہے :

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (البقرہ ۹ع)

اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا، پھر آپس میں اختلاف کیا اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپاتے تھے۔ پس ہم نے کہا کہ اس کو اس کے بعض سے مارو۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنے نشان دکھاتا ہے تا تم عقل سے کام لو۔

اس کے مشہور معنی اور عام تفسیر یہی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک قتل ہو گیا تھا۔ قاتل کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ مقتول کے ورثاء نے حضرت موسیٰؑ سے اس کے متعلق دریافت کرنے کی درخواست کی۔ اس سے پہلے ان کو امتحاناً ایک گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا اور انہوں نے بعد از خرابیٔ بسیار اس حکم کی تعمیل کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حکمِ الٰہی کی مصلحت اور اس کی تعمیل کا فائدہ بتلانے کے لیے حکم دیا کہ اسی گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم سے مس کرو۔ وہ اپنے قاتل کا نام بتلا دیگا۔ بنی اسرائیل کو احکامِ الٰہی کی عظمت اور ان کی تعمیل کی برکت و منفعت بتلانے کے لیے یہ طریقہ نہایت مناسب و موزوں تھا اور ایک خالی الذہن آدمی آیات کے سیاق و سباق سے یہی معنے سمجھے گا۔ لیکن چونکہ اس میں کچھ مافوق الفطرۃ اور خارقِ عادت واقعہ کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے مولوی محمد علی صاحب نے اس کی بالکل الگ تفسیر بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"قرائن صفائی سے بتاتے ہیں کہ ان الفاظ میں کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسا نبی جس کے قتل میں اختلاف ہوا ہو اور کامیابی نہ ہوئی ہو وہ مسیح علیہ السلام ہیں۔ گویا قوم یہود کی بے اعتدالیوں کا نقشہ کھینچا ہے کہ ایک طرف تو گائے ہمک کر ذبح کرنے میں اس قدر لیت ولعل کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک عظیم الشان نبی کو قتل کرنے میں اس قدر دلیری ہے۔ رہا یہ سوال کہ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا سے کیا مراد ہے؟ اضربوہ میں ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے کیونکہ بعض وقت نفس کی ضمیر بلحاظ معنی مذکر آجاتی ہے اور بعضھا کی ضمیر فعل قتل کی طرف جاتی ہے یعنی بعض قتل سے اس کو مار دو یا فعل قتل پورا اس پر وارد نہ ہونے دو اور یہی سچ ہے کہ حضرت مسیح پر پورا فعل قتل وارد نہیں ہوا صلیب پر آپ صرف تین گھنٹے رہے اور اتنی تھوڑی دیر میں کوئی شخص صلیب کی موت سے مر نہیں سکتا۔ آپ کے ساتھ جو چور صلیب دیے گئے تھے۔ ان کی ہڈیاں توڑی گئیں، آپ کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں یہی فاضربوہ ببعضھا ہے اور کذلک یحی اللہ الموتی کہہ کر بتلا دیا کہ جس کو تم مردہ خیال کر بیٹھے تھے۔ اسے خدا نے یوں زندہ رکھا۔"[1]

---

[1] ج ۱، صفحہ ۹۰
بیان القرآن

آیات کی یہ تفسیر اس ذہنیت کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک معجزہ کے وقوع سے بچنے کے لیے کس طرح تکلف سے کام لیا گیا ہے اور کس طرح مؤنث کی ضمیر کو مذکر اور مذکر (فعل قل) کی ضمیر کو مونث ثابت کیا گیا ہے اور سیاق و سباق کے بالکل خلاف ان آیات کو حضرت مسیحؑ سے متعلق کیا گیا ہے۔

۳۔ قرآن مجید نے حضرت مسیحؑ کا یہ قول بار بار دُہرایا ہے کہ میں بطور معجزہ اور ثبوت نبوت کے تمھارے سامنے مٹی کے جانور بناتا ہوں اور پھر ان کو پھونک مار کر ہوا میں پرندوں کی طرح اُڑاتا ہوں۔ اِنی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرًا باذن اللہ (سورۂ آل عمران ع ۵) اس میں بے جان چیزوں میں رُوح ڈالنے کے معجزہ سے بچنے کے لیے مولوی محمد علی صاحب نے اس آیت کو تمام تر استعارات پر مشتمل بتایا ہے وہ لکھتے ہیں:

"بزنگ استعارہ یہاں طیر سے مُراد ایسے لوگ ہیں جو زمین اور زمینی چیزوں سے اُوپر اُٹھ کر خُدا کی طرف پرواز کر سکیں اور یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کس طرح نبی کے نفخ سے انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ زمینی خیالات کو ترک کر کے عالم روحانیت میں پرواز کرنے لگے"۔

لہ ع ۱، صفحہ ۳۳۱

۴۔ سورۃ النمل میں آتا ہے کہ حضرت سلیمان نے تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ — اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے اور ہمیں ہر ایک چیز دی گئی۔

(النمل ع ۲)

چونکہ کسی انسان کا پرندوں کی بولی سمجھنا عام مشاہدات و تجربات کے خلاف ہے۔ اس لیے مولوی محمد علی صاحب نے اس سے نامہ بری مراد لی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سلطنت کے سامانوں میں بالخصوص قدیم زمانہ میں سب سے بڑا کام جو پرندوں سے لیا جاتا تھا، وہ نامہ بری کا کام تھا تو مجازاً وہ نامہ جو پرندہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے، منطق الطیر ہی کہلائے گا۔"[1]

اگلی آیت حتی اذا اتوا علی واد النمل قالت نملة یایھا النمل ادخلوا مساکنکم میں وادی النمل سے مراد مشہور تفسیر اور قتادہ محشی کے مطابق چیونٹیوں کا گاؤں نہیں بلکہ ان کے نزدیک یہ ایک عرب قبیلہ بنی نملہ نام کی وادی تھی اور نملۃ سے مراد اسی کا ایک فرد تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] ع ۲، صفحہ ۱۴۰۹

"یہ کوئی قوم تھی جن کو علم ہوا کہ حضرت سلیمان اپنی افواج کے ساتھ آ رہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ ایسا نہ ہو ہم خواہ مخواہ مخالف سمجھ کر مارے جائیں" [۱]

۵۔ سورہ سبا میں حضرت سلیمان کے متعلق ارشاد ہے:

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۚ	سو جب ہم نے اس پر (سلیمانؑ پر) موت کا حکم صادر کیا تو انھیں (جنات کو) اس کی موت کا پتہ کسی چیز نے نہ دیا مگر گھن کے کیڑے نے جو اس کا عصا کھاتا رہا۔
(السبا، ع ۲)	

مفسرین اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں کے ہاتھ سے مسجد بیت المقدس کی تجدید کرا رہے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ میری موت آپہنچی جنوں کو نقشہ بتا کر آپ ایک شیشہ کے مکان میں در بند کر کے عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ اسی حالت میں فرشتہ نے روح قبض کر لی۔ آپ کی نعش مبارک لکڑی کے سہارے کھڑی رہی۔ کسی کو آپ کی وفات کا احساس نہ ہو سکا۔ وفات کے بعد مدت تک جن بدستور تعمیر کرتے رہے۔ جب تعمیر پوری ہو گئی، جس عصا پر ٹیک لگا رہے تھے، گھن کے کھانے سے گرا۔ تب سب کو وفات کا حال معلوم ہوا۔ اس سے جنات کو خود اپنی غیب دانی کی حقیقت کھل گئی اور ان کے معتقد انسانوں کو بھی پتہ لگ گیا کہ اگر انھیں غیب کی خبر ہوتی تو کیا اس ذلت آمیز تکلیف میں پڑے رہتے" [۲]

---

[۱] ج ۳، صفحہ ۱۴۱۱ [۲] حاشیہ مولانا شبیر احمد عثمانی رہ

اس میں بھی چونکہ چند غیر معمولی واقعات اور آیاتِ قدرت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے مولوی محمد علی صاحب نے دابۃ الارض اور منسأۃ کے بالکل الگ معنی بیان کر کے لکھا ہے:

"اصل بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان کی وفات کے جلد ہی بعد اس سلطنت کی حالت خراب ہو گئی۔ حضرت سلیمان کے بیٹے رحبعام کے تخت نشین ہونے کے تھوڑی دیر بعد یربعام کی انگیخت پر بنی اسرائیل نے کچھ مطالبات پیش کیے۔ اس وقت حضرت سلیمان کے پرانے مشیروں نے رحبعام کو مشورہ دیا کہ وہ قوم کو تنگ نہ کرے اور ان کے مطالبات کو قبول کر لے۔ مگر اس نے بجائے ان مشیروں کی بات سننے کے اپنے نوجوان ساتھیوں کے کہنے پر بنی اسرائیل کے مطالبات کا سخت جواب دیا اور ان پر سختی کرنے کی ٹھانی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس قومیں باغی ہو گئیں اور حضرت سلیمان کی سلطنت برباد ہو گئی اور رحبعام کی حکومت صرف ایک چھوٹی سی شاخ پر رہ گئی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اسرائیلی قومیں بھی آزاد ہو گئیں (دیکھو سلاطین باب ۱۲) بس دابۃ الارض یہی رحبعام، حضرت سلیمان کا بیٹا ہے جس کی نظر صرف زمین تک محدود تھی اور سلیمان کے عصا کا کھایا جانا اس کی سلطنت کی بربادی ہے۔ اور جن سے مراد غیر قومیں ہیں جنھوں نے اب تک

بنی اسرائیل کی ماتحتی کا بڑا اٹھایا تھا۔[1]

۶- و تفقد الطیر فقال مالی | اور خبر لی اڑتے جانوروں کی تو کہا کیا
لا اری الھد ھد ام کان من | ہے جو میں نہیں دیکھتا۔ ہُدہُد کو، یا ہے وہ
الغائبین ○ (النمل ع ۲) | غائب؛

قدیم زمانہ سے اس وقت تک سب نے ہُدہُد سے مُراد مخصوص پرندہ سمجھا ہے اور سیاق و سباق بھی یہی بتلاتا ہے۔ اس لیے کہ اُوپر حضرت سلیمان کے پرندوں کی زبان جاننے کا ذکر ہے اور پرندوں ہی کا اس موقع پر وہ جائزہ لے رہے ہیں۔ و تفقد الطیر لیکن چونکہ اس واقعہ میں ایک غرابت اور خارق عادت بات ہے کہ پرندہ سے کوئی انسان بات چیت کرے اور اس کا محاسبہ کرے۔ اور وہ اپنی کارگزاری پیش کرے۔ اس لیے مولوی محمد علی صاحب کے نزدیک ہُدہُد سے مُراد حضرت سلیمانؑ کے صیغۂ خبر رسانی کا افسرِ اعلیٰ یا خفیہ پولیس کا انسپکٹر جنرل مراد ہے وہ لکھتے ہیں:

"ہُدہُد کسی شخص کا نام ہے جو اس محکمۂ خبر رسانی سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی موجودگی جائزہ کے وقت ضروری تھی کیونکہ پرندوں سے خبر رسانی کا ہی کام لیا جاتا تھا تو حضرت سلیمان نے جب پرندوں کو طلب کیا تاکہ سب ساتھیوں کی حالت سے واقفیت حاصل کریں تو افسرِ محکمہ کو غائب پایا تو فرمایا، ہُدہُد کہاں ہے؟ اور پرندوں اور جانوروں

---

[1] ۳ ع ۳۶۰ صفحہ ۱۵۳۶

کے ناموں پر انسانوں کے نام عام طور پر رکھے جاتے ہیں فکس (لومڑ) اور ولف (بھیڑیا) وغیرہ آج مہذب قومیں بھی اپنے نام رکھتی ہیں اور ہندوؤں میں طوطا رام اور مسلمانوں میں شیر اور باز بلکہ شیر باز عام نام ہیں۔ عرب میں بھی ایسے نام رکھ لیے جاتے تھے۔ جیسے اسد اللہ وغیرہ

۷۔ قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ (الجن ۱:۷۲) — تم کہہ دو کہ مجھ کو حکم آیا کہ کتنے جنوں کے رگ سن گئے، پھر کہنے لگے کہ ہم نے ایک قرآن عجیب سنا ہے۔

یہاں جن سے مراد خدا کی وہی مخلوق ہے جو عام طور پر نظروں سے مخفی رہتی ہے اور جس کا ثبوت قرآن و حدیث متواتر اور مشاہدہ سے ہے۔ اس آیت میں مفسرین کے نزدیک اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ صبح کی نماز میں قرآن پڑھ رہے تھے کئی جن ادھر کو گزرے اور قرآن کی آواز پر فریفتہ ہو کر سچے دل سے ایمان لے آئے۔ پھر اپنی قوم میں جا کر سب ماجرا بیان کیا۔[۱]

لیکن مولوی محمد علی صاحب نے لغت عرف، کلام عرب اور تفسیر مشہور کے برخلاف جن سے مراد عیسائی قومیں لی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جن سے مراد انسان ہی ہیں چونکہ یہ باہر کے لوگ تھے جو

---

[۱] ج ۵ صفحہ ۱۳۱۳ — [۲] حواشی مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رہ

اہلِ عرب کی نظر سے مخفی تھے، اس لیے انھیں جن کہا گیا ہے اور یہ جن عیسائی تھے:

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ممکن ہے یہ سب ذکر بطور پیش گوئی کے ہو اور مطلب یہ ہو کہ عیسائی اقوام جو بوجہ اپنی عظمت کے کبھی جن کی حیثیت حاصل کریں گے آخر اُن کا ایک حصّہ بھی قرآن کریم کی صداقت پر ایمان لائے گا۔"[1]

یہاں ہم انھیں چند نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ یہ تفسیر جو تین ضخیم جلدوں میں ہے، انھیں نوادرِ تفسیر سے بھری ہوئی ہے۔

اس جگہ ایک سلیم الفطرت انسان کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صحابۂ کرامؓ جو قرآن مجید کے مخاطبِ اوّل تھے اور قرآن مجید اُن کی زبان میں نازل ہوا تھا اور صحبتِ نبوی سے انھوں نے قرآن مجید کا صحیح فہم حاصل کیا تھا۔ ان آیات کے یہی معانی سمجھتے تھے؟ کیا وہ بھی اضرب بعصاك الحجر سے جماعت کر پہاڑ پر لے جانے کا مفہوم سمجھتے تھے فاضربوه ببعضها کے معنی اُن کے نزدیک بھی یہی تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام پر فعلِ قتل کا امر پورا وارد نہ ہونے دو۔ طیر سے مراد وہ مزکّٰی نفوس ہیں جو زمین اور زمینی چیزوں سے بلند ہو کر خدا کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ منطق الطیر سے مراد نامہ بر کبوتر ہیں اور وادی

---

[1] ج ۳، صفحہ ۱۸۹۳ء

النمل سے مراد کسی قبیلہ کی بستی ہے۔ دابۃ الارض سے مراد حضرت سلیمان کا بیٹا رحبعام ہے جس کی نظر صرف زمین تک محدود تھی ھُدھُد سے مراد حضرت سلیمان کے محکمۂ خبر رسانی کا افسرِ اعلیٰ ہے۔ سورۂ جن میں جن کے لفظ سے مراد یورپ کی عیسائی قومیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح کیا تابعین اور ان کے بعد کے اہلِ زبان اور علماء و مفسرین میں سے کسی نے ان آیات اور الفاظ کے یہ معنی سمجھے۔ اثبات میں تو اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ اس لیے کہ متقدمین کا تفسیری وغیرہ ہمارے سامنے ہے، ان میں کہیں اس کا وجود نہیں اور خود اس زمانہ کے اہلِ عربیت اور ادباء کا ذہن بھی ان معانی کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر واقعہ یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے تیرہ سو برس بعد ایک عجمی نژاد کے ذہن میں پہلی مرتبہ ان آیات و الفاظ کے یہ معانی آئے ہیں، تو قرآن مجید جو جا بجا اپنے لیے اَلْكِتٰبُ الْمُبِيْنُ (واضح کتاب)، عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (واضح عربی زبان) کے الفاظ استعمال کرتا ہے، ان کا کیا مطلب ہے؟ سورۂ شعراء میں ارشاد ہوتا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ لے کر اترا ہے اس کو فرشتۂ معتبر
عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ تیرے دل پر کہ تو ہو ڈر سنا دینے والا
بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ (الشعراء ۲۶) کھلی عربی زبان میں۔

الٓرٰ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی،

الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

ہم نے اس کو اتارا ہے۔ قرآن عربی زبان کا، تاکہ تم سمجھ لو۔

(یوسف ۲، ع ۱)

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے سمجھنے کے لیے، پھر ہے کوئی سوچنے والا۔

(القمر ع ۱)

اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ قرآن مجید کی آیات تیرہ سو برس تک مُعمّا اور چیستان بنی رہیں اور اس کی ہدایت تیرہ سو برس کے بعد سے شروع ہوئی۔ الفاظ کے ظاہری اور کثیر الاستعمال معنی عربیّت کے اصُول و قواعد، قرآن کے مخاطبین اوّلین کے فہم، آیات کے سیاق و سباق اور احادیثِ صحیحہ سے صرفِ نظر کر کے قرآن مجید کی تفسیر کرنا، قرآنِ مجید کی تحریفِ معنوی اور تلاعُب بالقرآن (قرآن کو کھیل بنا لینا ہے) جو الحاد کا دروازہ کھولتا ہے اور کلامِ الٰہی کو تختۂ مشق اور بازیچۂ اطفال بنا دیتا ہے اور اُمّت کے بہترین افراد اور بہترین زمانہ کی نافہمی اور جہالت کا ثبوت ہے۔ عرصہ ہُوا مرزا غلام احمد صاحب نے سرسیّد کی تفسیر پر تبصرہ کرتے ہُوئے لکھا تھا (مولوی محمّد علی صاحب کی تفسیر پر بھی اس سے بہتر تبصرہ ممکن نہیں)

"جو تاویلیں قرآن کریم کی نہ خداوند تعالیٰ کے علم میں تھیں، نہ اُس کے رسُول کے علم میں، نہ صحابہ کے علم میں، نہ اولیاء اور قطبوں اور غوثوں اور ابدال کے علم میں اور نہ ان پر دلالت النص نہ اشارۃ النص، وُہ سیّد صاحب کو سُوجھیں"[۱]

---

[۱] آئینہ کمالات اسلام ص۲۴۲

فصلِ چہارم

قادیانیت نے عالمِ اسلام کو کیا عطا کیا؟

اب جب ہم اپنے اس تحقیقی سفر کی آخری منزل پر پہنچ گئے ہیں اور اس کتاب کی آخری سطریں زیرِ تحریر ہیں ہم کو ایک عملی اور حقیقت پسند انسان کے نقطۂ نظر سے تحریکِ قادیانیت کا تاریخی جائزہ لینا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے اسلام کی تاریخِ اصلاح و تجدید میں کونسا کارنامہ انجام دیا اور عالمِ اسلام کی جدید نسل کو کیا عطا کیا؟ نصف صدی کی اس پُرشور اور ہنگامہ خیز مدّت کا حاصل کیا ہے؟ تحریک کے بانی نے اسلامی مسائل اور متنازع فیہ امور پر جو ایک وسیع و عجیب کتب خانہ[1] یادگار چھوڑا ہے اور جو تقریباً ۷۰ برس سے موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ اور ماحصل کیا ہے؟ قادیانیت عصرِ جدید کے لیے کیا پیغام رکھتی ہے؟

ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لیے پہلے ہم کو اس عالمِ اسلامی پر ایک نظر ڈالنی چاہیے جس میں اس تحریک کا ظہور ہوا اور یہ دیکھنا چاہیے کہ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں اس کی کیا حالت تھی اور اس کے کیا حقیقی مسائل و مشکلات تھے۔

---

[1] مرزا صاحب کی تصنیفات کی تعداد ۸۰ سے کم نہیں ہے ان میں اکثر نہایت ضخیم اور کئی کئی جلدوں کی کتابیں ہیں۔

اس عہد کا سب سے بڑا واقعہ جس کو کوئی مؤرخ اور کوئی مُصلح نظر انداز نہیں کرسکتا، یہ تھا کہ اسی زمانہ میں یورپ نے عالم اسلام پر بالعموم اور ہندوستان پر بالخصوص یورش کی تھی۔ اس کے جلو میں جو نظام تعلیم تھا وُہ خدا پرستی اور خدا شناسی کی رُوح سے عاری تھا، جو تہذیب تھی وُہ الحاد اور نفس پرستی سے معمور تھی۔ عالم اسلام، ایمان، علم اور مادّی طاقت میں کمزور ہو جانے کی وجہ سے اس نوخیز و مُسلّح مغربی طاقت کا آسانی سے شکار ہو گیا۔ اس وقت مذہب میں (جس کی نمائندگی کے لیے صرف اسلام ہی مَیدان میں تھا) اور یورپ کی مُلحدانہ اور مادہ پرست تہذیب میں تصادم ہوا۔ اس تصادم نے ایسے نئے سیاسی، تمدنی، علمی اور اجتماعی مسائل پیدا کر دیے جن کو صرف طاقتور ایمان، راسخ و غیر متزلزل عقیدہ و یقین، وسیع اور عمیق علم، غیر مشکوک اعتماد و استقامت ہی سے حل کیا جا سکتا تھا۔ اس صُورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک طاقتور علمی و رُوحانی شخصیت کی ضرورت تھی جو عالم اسلام میں رُوحِ جہاد اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کر سکے جو اپنی ایمانی قوت اور دماغی صلاحیت سے دین میں ادنیٰ تحریف و ترمیم قبول کیے بغیر اسلام کے ابدی پیغام اور عصرِ حاضر کی بے چین رُوح کے درمیان مصالحت و رفاقت پیدا کر سکے اور شوخ و پُرجوش مغرب سے آنکھیں ملا سکے۔

دُوسری طرف عالم اسلام مختلف دینی و اخلاقی بیماریوں اور کمزوریوں کا شکار تھا اس کے چہرہ کا سب سے بڑا داغ وُہ شرکِ جلی تھا جو اس کے گوشہ گوشہ میں پایا

جاتا تھا۔ قبریں اور تعزیے بے محابا پُج رہے تھے۔ غیراللہ کے نام کی صاف صاف دہائی دی جاتی تھی۔ بدعات کا گھر گھر چرچا تھا۔ خرافات اور توہمات کا دَور دَورہ تھا۔ یہ صورتِ حال ایک ایسے دینی مصلح اور داعی کا تقاضا کر رہی تھی جو اسلامی معاشرہ کے اندر جاہلیت کے اثرات کا مقابلہ اور مسلمانوں کے گھروں میں اس کا تعاقب کرے جو پوری وضاحت اور جرأت کے ساتھ توحید و سُنّت کی دعوت دے اور اپنی پُوری قوت کے ساتھ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ کا نعرہ بلند کرے۔

اسی کے ساتھ بیرونی حکومت اور مادہ پرست تہذیب کے اثر سے مسلمانوں میں ایک خطرناک اجتماعی انتشار اور افسوسناک اخلاقی زوال رُونما تھا۔ اخلاقی انحطاط فسق و فجور کی حد تک تعیش و اسراف نفس پرستی کی حد تک حکومت و اہلِ حکومت سے مرعوبیت ذہنی غلامی اور ذِلت کی حد تک۔ مغربی تہذیب کی نقالی اور حکمران قوم (انگریز) کی تقلید کفر کی حد تک پہنچ رہی تھی۔ اس وقت ایک ایسے مُصلح کی ضرورت تھی جو اس اخلاقی و ذہنی انحطاط کی بڑھتی ہوئی رَو کو روکے اور اس خطرناک رُجحان کا مُقابلہ کرے جو محکومیت و غلامی کے اس دَور میں پیدا ہو گیا تھا۔

تعلیمی و علمی حیثیت سے حالت یہ تھی کہ عوام اور محنت کش طبقہ دین کے مبادی اوّلیات سے ناواقف اور دین کے فرائض سے بھی غافل تھا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ شریعتِ اسلامی، تاریخِ اسلام اور اپنے ماضی سے بے خبر اور اسلام کے مستقبل سے مایوس تھا۔ اسلامی علوم رُو بہ زوال اور پُرانے تعلیمی مرکز عالمِ نزع میں تھے

اس وقت ایک طاقتور تعلیمی تحریک اور دعوت کی ضرورت تھی۔ نئے مکاتب و مدارس کے قیام، نئی اور مؤثر اسلامی تصنیفات اور نئے سلسلۂ نشر و اشاعت کی ضرورت تھی جو اُمّت کے مختلف طبقوں میں مذہبی واقفیت، دینی شعور اور ذہنی اطمینان پیدا کرے۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر عالمِ اسلام کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام کے طریقِ دعوت کے مطابق اس اُمّت کو ایمان اور عملِ صالح اور اس صحیح اسلامی زندگی اور سیرت کی دعوت دی جائے جس پر اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت، دشمنوں پر غلبہ اور دین و دُنیا میں فلاح و سعادت اور سربلندی کا وعدہ فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمِ اسلام کی ضرورت دینِ جدید نہیں ایمانِ جدید ہے۔ کسی دَور میں بھی اس کو نئے دین اور نئے پیغمبر کی ضرورت نہیں تھی۔ دین کے ان ابدی حقائق و عقائد اور تعلیمات پر نئے ایمان اور نئے جوش کی ضرورت تھی، جس سے زمانہ کے نئے فتنوں اور زندگی کی نئی ترغیبات کا مقابلہ کیا جا سکے۔

زندگی کے ان شعبوں اور ضرورتوں کے لیے جن کا اوپر تذکرہ ہُوا۔ عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں میں مختلف شخصیتیں اور جماعتیں سامنے آئیں۔ جنھوں نے بغیر کسی دھوے اور بغیر امتِ سازی کی کوشش کے وقت کی ان ضرورتوں اور مطالبوں کو پُورا کیا اور مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ اُنھوں نے کسی نئے مذہب اور کسی نئی نبوّت کا علَم بلند نہیں کیا اور نہ مسلمانوں میں کوئی تفریق اور انتشار پیدا کیا۔

انھوں نے اپنی صلاحیتوں اور عملی قوتوں کو کسی بے نتیجہ کام میں ضائع نہیں کیا۔ ان کا نفع ہر ضرر سے خالی، اُن کی دعوت ہر خطرہ سے پاک اور ان کا کام ہر شبہ سے بالاتر ہے۔ عالمِ اسلام نے اپنا کچھ کھوئے بغیر ان سے نفع حاصل کیا اور مسلمان اُن کی مخلصانہ خدمات کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔

ایک ایسے نازک وقت میں عالمِ اسلام کے نازک ترین مقام ہندوستان میں جو ذہنی و سیاسی کش مکش کا خاص مَیدان بنا ہُوا تھا۔ مرزا غلام احمد صاحب اپنی دعوت اور تحریک کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ وُہ عالمِ اسلام کے حقیقی مسائل و مشکلات اور وقت کے اصلاحی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوُئے اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں، جلم و قلم کی طاقت ایک ہی موضوع اور مسئلہ پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ وُہ مسئلہ کیا ہے؟ "وفاتِ مسیح اور مسیح موعود کا دعوٰی" اس مسئلہ سے جو کچھ وقت بچتا ہے۔ وُہ حرمتِ جہاد اور حکومتِ وقت کی وفاداری اور اخلاص کی دعوت کے نذر ہو جاتا ہے۔ رُبع صدی کی تصنیفی و علمی زندگی اور جد و جہد کا موضوع اور ان کی دلچسپیوں کا مرکز یہی مسئلہ اور اس کے سلسلہ میں مخالفین سے نبرد آزمائی اور معرکہ آرائی ہے۔ اگر ان کی تصنیفات سے ان مضامین کو خارج کر دیا جائے جو حیاتِ مسیح و نزولِ مسیح اور ان کے دعاوی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل و مباحث سے متعلق ہیں تو اُن کے تصنیفی کارنامہ کی ساری اہمیت اور وُسعت ختم ہو جائے گی۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ اس عالمِ اسلام میں جو پہلے سے مذہبی اختلافات اور دینی

نزاعات کا شکار تھا اور جس میں اب کسی نئے نزاع کے برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی، وہ نئی نبوت کا علم بلند کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان نہ لائے اُس کی تکفیر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اور مسلمانوں کے درمیان ایک آہنی ناقابلِ عبور دیوار کھڑی کر دیتے ہیں جس کے ایک جانب ان کے متبعین کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے جو چند ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ دُوسری طرف پورا عالمِ اسلام ہے جو مراکش سے چین تک پھیلا ہوا ہے اور جس میں عظیم ترین افراد، صالح ترین جماعتیں اور مفید ترین ادارے ہیں۔ اس طرح انھوں نے عالمِ اسلام میں بلا ضرورت ایک ایسا انتشار اور ایک ایسی نئی تقسیم پیدا کر دی۔ جس نے مسلمانوں کی مشکلات میں ایک نیا اضافہ اور عصرِ حاضر کے مسائل میں نئی پیچیدگی پیدا کر دی

مرزا غلام احمد صاحب نے درحقیقت اسلام کے علمی و دینی ذخیرہ میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا جس کے لیے اصلاح و تجدید کی تاریخ ان کی معترف اور مسلمانوں کی نسلِ جدید اُن کی شکرگزار رہو۔ انھوں نے نہ تو کوئی عمومی دینی خدمت انجام دی جس کا نفع دُنیا کے سارے مسلمانوں کو پہنچے۔ نہ وقت کے جدید مسائل میں سے کسی مسئلہ کو حل کیا، نہ ان کی تحریک مرجوعہ انسانی تہذیب کے لیے جو سخت مشکلات اور سرت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہے کوئی پیغام رکھتی ہے۔ نہ اُس نے یورپ اور ہندوستان کے اندر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کی جد و جہد کا تمام تر میدان مسلمانوں کے اندر رہے اور اس کا نتیجہ

صرف ذہنی انتشار اور غیر ضروری مذہبی کشمکش ہے جو اس نے اسلامی معاشرے میں پیدا کر دی ہے۔ وہ اگر کسی چیز میں کامیاب کہے جا سکتے ہیں تو صرف اس میں کہ انھوں نے اپنے خاندان اور ورثا کے لیے سر آغا خاں کے اسلاف کی طرح پیشوائی کی ایک مسند اور ایک دینی ریاست پیدا کر دی ہے جس کے اندر ان کو رُوحانی سیادت اور مادی عیش و عشرت حاصل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں وہ ذہنی انتشار نہ ہوتا جس کا پنجاب خاص میدان تھا اگر انگریزی حکومت کے اثر سے اسلامی معاشرہ میں اسلام کی بنیادیں متزلزل اور اسلامی ذہن ماؤف نہ ہو چکا ہوتا۔ اگر مسلمانوں کی نئی نسل دینی تعلیمات اور اسلام کی اصلاحی و تجدیدی شخصیتوں اور نیابت انبیاء اور عظمت انسانی کی حقیقی صفات سے اتنی بے خبر نہ ہوتی اور آخر میں حکومت وقت کی پشت پناہی اور سرپرستی نہ ہوتی، تو یہ تحریک جس کی بنیاد زیادہ تر الہامات، خوابوں، تاویلات اور بے کیف و بے مغز نکتہ آفرینیوں پر ہے اور جو عصر جدید کے لیے کوئی نیا اخلاقی و رُوحانی پیغام اور مسائل حاضرہ کو حل کرنے کے لیے کوئی مجتہدانہ مقام نہیں رکھتی۔ کبھی بھی اتنی مدت باقی نہیں رہ سکتی تھی جیسی کہ اس برسر اختلاط سوسائٹی اور اس پراگندہ دماغ پراگندہ دل نسل میں رہ سکی۔ اسلام کی صحیح تعلیمات اور دعوت سے انحراف اور ان مخلصین مجاہدین کی (جو ماضی قریب میں اس ملک میں پیدا ہوئے اور اسلام کے عروج اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اپنا سب کچھ لٹا کر چلے گئے)۔ ناقدری کی سزا خدا

نے یہ دی کہ ہندوستانی مسلمانوں پر ایک ذہنی طاعون کو مسلط کر دیا اور ایک شخص کو ان کے درمیان کھڑا کر دیا جو امت میں فساد کا مستقل بیج بو گیا ہے۔

دو سال ہوئے دمشق یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ کے سامنے اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید کے موضوع پر ایک سلسلۂ تقریر کے دوران میں راقم سطور نے تحریک باطنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

حضرات! میں جب باطنیت، اخوان الصفا اور ایران کی بہائی اور ہندوستان کی قادیانی تحریک کی تاریخ پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ ان تحریکوں کے بانیوں نے اسلام اور بعثت محمدی کی تاریخ پڑھی تو انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص تن تنہا جزیرۃ العرب میں ایک دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نہ مال ہے، نہ اسلحہ۔ وہ ایک عقیدہ اور ایک دین کی دعوت دیتا ہے اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ ایک نئی امت، ایک نئی حکومت، ایک نئی تہذیب وجود میں آجاتی ہے، وہ تاریخ کا رخ تبدیل کر دیتا ہے اور واقعات کا دھارا بدل دیتا ہے۔ ان کی بلند حوصلہ طبیعتوں نے ان سے کہا کہ اس کا نیا تجربہ کیوں نہ کیا جائے؟ انھوں نے دیکھا کہ وہ ذہانت، دماغی صلاحیت، تنظیمی لیاقت بھی رکھتے ہیں اور پڑھے لکھے لوگ ہیں پھر کیوں نہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور کس طرح انھیں واقعات کا ظہور نہ ہوگا جو طبعی اسباب اور عمل کے ماتحت گزشتہ دور میں ہو چکے ہیں۔ ان کو امید تھی کہ پھر اسی معجزہ کا ظہور ہوگا جس کا تاریخ نے

چھٹی صدی مسیحی میں مشاہدہ کیا، اس لیے کہ فطرت انسانی ناقابل تبدیل ہے اور لوگوں میں ہمیشہ سے ہر دعوت قبول کرنے کی صلاحیت رہی ہے۔

ان بلند حوصلہ انسانوں نے اس یکہ و تنہا ہستی کو تو دیکھا جو بغیر کسی سرمایہ اور بغیر کسی زری طاقت و حمایت کے ایک دینی دعوت لے کر کھڑی ہوئی لیکن اس کے پیچھے اس ربانی حمایت اور ارادہ الٰہی کو نہیں دیکھا جو اس کی کامیابی، غلبہ اور قیامت تک باقی رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور جس نے اعلان کر دیا تھا:

هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ	وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول ہدایت
بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى	اور سچے دین کے ساتھ تاکہ اس کو سب دینوں پر
الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ	غالب کرے خواہ شرک کرنے والے کتنا ہی برا مانیں

(الصف، ع ۱)

نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی طور پر ان کی کوششیں کامیاب اور بارآور ہوئیں اور انھوں نے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اپنے ساتھی اور پیرو پیدا کر لیے۔ ان میں سے بعض (باطنیہ) نے عظیم الشان سلطنت (فاطمیہ) بھی قائم کر لی اور یہ سلطنت عرصہ تک پھلی پھولی اور ایک زمانہ میں اُس نے سوڈان سے مراکش تک قبضہ کر لیا، لیکن جب تک اُن کی تنظیم ان کے مخفی انتظامات اور ان کی شعبدہ بازیاں باقی رہیں یہ عروج بھی باقی رہا لیکن پھر وقت آیا کہ یہ سب عروج و اقتدار اور یہ سب ترقی و اقبال ایک افسانہ بن کر رہ گیا۔ ان کے مذاہب ایک مختصر دائرہ

میں محدود ہو کر رہ گئے جن کا زندگی پر کوئی اثر اور دنیا میں کوئی مقام نہیں۔

اس کے بالمقابل اسلام جس کو رسول اللہؐ لے کر آئے، وہ آج بھی دنیا کی عظیم ترین روحانی طاقت ہے اور آج اس کے ساتھ ایک عظیم الشان امت ہے۔ آج بھی وہ ایک تہذیب رکھتا ہے اور بہت سی سلطنتوں اور قوموں کا مذہب ہے۔ نبوت محمدی کا آفتاب آج بھی بلند اور روشن ہے اور تاریخ کے کسی دور میں بھی وہ گہن میں نہیں آیا۔

کتبہٗ

خاکپائے جناب خاتمِ رُسل شفیعِ کریمؐ :

احقر انور حسین نفیس شبیری غفرلہٗ سیالکوٹی ثم لاہوری

شعبان المعظم ۱۳۶۸ھ

کتاب کے مآخذ

اس کتاب میں مرزا غلام احمد صاحب اور قادیانی مصنفین کی جن کتابوں کے اقتباسات اور حوالے پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے نام بہ ترتیب حروف تہجی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ جن کتابوں پر ایڈیشن، سن طباعت اور مطبع کا نام درج ہے، اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ کتابوں کی مختلف اشاعتوں کے صفحات میں بڑا فرق و تفاوت ہے۔

۱۔ الاربعین — طبع دوم سنہ ۱۹۲۰ء

۲۔ ازالہ اوہام — طبع سوم سنہ ۱۹۰۲ء

۳۔ آسمانی فیصلہ — مطبع ضیاء الاسلام قادیان سنہ ۱۹۱۸ء

۴۔ اعجاز احمدی — سنہ ۱۹۰۲ء

۵۔ انجام آتھم — سنہ ۱۸۹۶ء

۶۔ انوار خلافت — ۱۹۱۶ء

۷۔ آئینہ کمالات اسلام — طبع دوم سنہ ۱۹۲۳ء

۸۔ ایک غلطی کا ازالہ

۹۔ براہین احمدیہ — طبع چہارم سنہ ۱۹۰۵ء

۱۰۔ بیان القرآن از مولوی محمد علی لاہوری جلد اول سنہ ۱۹۲۰ء مطبع عسکری پریس

بیان القرآن — جلد دوم سنہ ۱۹۲۲ء

" " — جلد سوم سنہ ۱۹۲۳ء

۱۱۔ پیغام صلح لاہور

۱۲۔ تبلیغ رسالت

۱۳۔ تحفۃ الندوۃ — مطبع ضیاء الاسلام قادیان

۱۴۔ تریاق القلوب — " " "

۱۵۔ تشحیذ الاذہان

۱۶۔ توضیح مرام — طبع دوم سنہ ۱۸۹۰ء

۱۷۔ حقیقۃ الوحی — سنہ ۱۹۰۷ء

۱۸۔ حقیقۃ النبوۃ — سنہ ۱۹۱۵ء

۱۹۔ الحکم

۲۰۔ حیاتِ ناصر

۲۱۔ خطبۂ الہامیہ سنہ ۱۹۰۲ء

۲۲۔ تذکرۃ الشہادتین

۲۳۔ ردِّ تکفیرِ اہلِ قبلہ مطبع اسلامیہ پریس سنہ ۱۹۲۶ء

۲۴۔ ریویو آف ریلیجنز

۲۵۔ سُرمۂ چشمِ آریہ طبع اوّل سنہ ۱۸۸۶ء

۲۶۔ سیرۃ المہدی (حصہ اول و دوم) طبع دوم سنہ ۱۹۳۵ء

(حصہ سوم) طبع اول سنہ ۱۹۳۹ء

۲۷۔ شہادۃ القرآن مطبع شیخ چند امرتسر

۲۸۔ فتحِ اسلام سنہ ۱۸۹۳ء

۲۹۔ اخبار الفضل

۳۰۔ کتاب البریہ طبع دوم سنہ ۱۹۳۲ء

۳۱۔ کشف الاختلاف مطبع ضیاء الاسلام قادیان فروری سنہ ۱۹۲۰ء

۳۲۔ کلماتِ الفضل

۳۳۔ مرقاۃ الیقین فی حیاۃ نور الدین، شائع کردہ انجمن اشاعتِ اسلام احمدیہ بلڈنگس لاہور

۳۴۔ معیار الاخیار

۳۵۔ مکتوباتِ احمدیہ حصہ پنجم

۳۶۔ نجم الہدیٰ

۳۷۔ نزول المسیح طبع اوّل سنہ ۱۹۰۹ء

۳۸۔ نور الحق